استحکامِ پاکستان (حصہ دوم)

پاکستان میں اسلامی انقلاب: کیا؟ کیوں؟ اور کیسے؟ (۱)

قد اخذ میثاقکم ان کنتم مومنین

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۳۶-کے ماڈل ٹاؤن — لاہور

پنجاب بیوریجز کمپنی لمیٹڈ۔ فیصل آباد۔ فون: ۲۶۰۳۱ / ۲۳۹۳۱

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ــــ ۳۵

شمارہ ــــ ۱۲

دسمبر ۱۹۸۶ء

بمطابق

ربیع الثانی ۱۴۰۷ھ

زر سالانہ ۴۰/- روپے

فی شمارہ ۴/- روپے

اس شمارے کی قیمت ۵ روپے

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

حافظ عاکف سعید

مینیجنگ ایڈیٹر: اقتدار احمد

چودھری رشید احمد

مکتبہ تنظیم اسلامی

۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴ فون ۸۵۲۶۸۳

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی: فون ۲۱۶۵۸۲

مشمولات

- عرضِ احوال ——— ۳
  "اے خامۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے"
  ——— اقتدار احمد
- پاکستان میں اسلامی انقلاب : کیا؟ کیوں اور کیسے؟ (۱) ——— ۹
  ——— ڈاکٹر اسرار احمد
- الہدیٰ (نشست ۴۰) ——— ۳۱
  بندۂ مومن کی شخصیت کے خدوخال
  ——— ڈاکٹر اسرار احمد
- قندِ مکرّر ——— ۴۱
  "کَلَّآ اِنَّہَا تَذْکِرَۃٌ"
  ——— مولانا امین احسن اصلاحی کا ایک اہم خطاب
- یزید کی ولی عہدی اور سانحۂ کربلا کا تاریخی پس منظر ——— ۵۷
  فلسفۂ انقلاب کی روشنی میں
  ——— ڈاکٹر اسرار احمد
- نجومِ ہدایت ——— ۷۳
  سیدہ امِ حکیم رضی اللہ عنہا
  ——— ترجمہ: مولانا شبیر احمد نورانی
- حسنِ انتخاب ——— ۷۷
  فریاد ہے فریاد
  ——— ارتضےٰ حیدر
- رفتارِ کار ——— ۸۹
  ——— چودھری غلام محمد
- افکار و آثار ——— ۹۳

عرضِ احوال

افتدار احمد

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دُعا ہے

برادرِ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور تنظیمِ اسلامی جس کی ترجمانی کے فرائض 'میثاق'، ادا کرتا ہے، کا یہ مشترکہ اور متفقہ موقف بارہا اِن صفحات میں شرح و بسط سے بیان ہو چکا ہے کہ ہم اگرچہ 'انتخابی سیاست' سے بالکلیہ احتراز کرتے ہیں لیکن نظری سیاست سے اغماض ہمارے نزدیک صرف ایک کوتاہی نہیں بلکہ مجرمانہ تغافل ہے۔

اللہ تعالیٰ کی وسیع و عریض زمین کا یہ قطعہ "پاکستان" جس سے ہماری اپنی اور ہماری اگلی نسلوں کی دنیاوی فلاح و بہبود وابستہ ہے اِس وقت اندیشہ ہائے قریب و قریں اور خدشاتِ واقعی و حقیقی کی چڑھتی ہوئی بھیانک اور سیاہ آندھیوں کے نرغے میں ہے۔ اَللّٰھُم انا نعوذ بك من جهد البلآء وَدَرْكِ الشقآءِ وَ سُوْءِ القضآءِ و شماتة الاعدآءِ - آمین۔ کہنے سننے اور آہ و زاری کے لئے کوئی ایک مضمون نہیں کہ اُسی کو سو رنگ سے باندھنے کی ضرورت ہو۔ مسائل کی کلیلہ و دمنہ ہے۔ تن ہمہ داغ داغ شُد، پنبہ کجا کجا نہم۔ لیکن ان صفحات کی تنگ دامانی اور راقم کے قلم کی عاجزی اس وقت محض دو اُمور پر مختصر اور اشاراتی گفتگو کا موقع فراہم کرتی ہے۔

مطالبۂ نفاذِ شریعت اور قومی پارلیمان پر نجی شریعت بل کی پذیرائی اور منظوری کیلئے دباؤ ڈالنے کی مہم ان دنوں دینی حلقوں کی ترجیحات میں اوّلین مقام رکھتی ہے اور تنظیمِ اسلامی کو بھی متحدہ شریعت محاذ اور اس کی مہم میں بساط بھر دامے، درمے قدمے، سخنے شریک رہنے کی سعادت میسّر ہوئی۔ اس سلسلے میں ہمارا نقطۂ نظر پچھلے ماہ کے 'میثاق'، میں تفصیل سے آچکا ہے جس میں بعض ذہنوں میں اُٹھنے والے ان سوالات کا شافی جواب بھی موجود تھا کہ 'سیاست' سے ہمارا اعلان برأت ـــــ وہ کیا ہوا؟ اور سیاسی محاذوں میں ہماری شرکت ـــــ چہ معنی دارد؟ - اس وقت جس صورت

جاں پر دل خون کے آنسو رو رہا ہے وہ مطالبۂ نفاذِ شریعت کا ردِّ عمل نہیں، مہم کی کامیابی یا ناکامی کے امکانات بھی نہیں خود **شریعت** پر انگشت نمائی اور واویلے کی وہ کیفیت ہے جس سے (یہ کہتے ہوئے دل لرزتا ہے کہ) اس اسلامی جمہوریۂ پاکستان جو اللہ تعالیٰ کا عطیۂ خاص ہے، کے اربابِ حکومت، اہلِ سیاست، قبیلۂ دانشوراں، طبقاتِ مراعات یافتگاں، مغرب زدہ خواتین وحضرات، مادیت والحاد کے مارے دوست نما دشمن اور — معاذ اللہ — خود علماء کے بعض حلقوں نے آسمان سر پہ اٹھا رکھا ہے گویا نفاذِ شریعت کا مضمون تو کم پھیلا تُو تکار کا جوتا خوب چل گیا۔[1] ہمارے اخبارات وجرائد اگرچہ قولِ فیصل کو بھی طوعاً وکرہاً اپنے کالموں میں جگہ دے دیتے ہیں لیکن خوفِ خدا سے آزاد ہو کر (الا ما شاء اللہ) اس مسئلے پر ہر طرح کا رطب ویابس رنگین چوکھٹوں میں تزئین وآرائش کے ساتھ پورے ذوق وشوق سے شائع کر رہے ہیں۔ جہاں بعض اہلِ قلم توجہ طلب مسائل کی نشاندھی کرتے ہیں — اگرچہ ان کی نیت سے بھی محض اللہ تعالیٰ آگاہ ہے، مقصود وضاحت طلبی ہوتی ہے یا مغالطوں کا گرد وغبار اُٹھانا — وہاں دینِ حنیف اور شریعتِ حقہ پر جرأتِ رندانہ سے کام لیتے ہوئے ایسے ایسے رکیک جملے بھی قرطاس کو آلودہ کر رہے ہیں کہ عجب نہیں اللہ تعالیٰ کے غضب سے عرش کانپتا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ملک وملت اور امتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے سب ہی خواہوں کو اس توفیق کی ارزانی وقت کی اہم ترین ضرورت ہے کہ وہ مالک الملک تعالیٰ کی بارگاہ میں نہایت الحاح وزاری سے دعائیں کریں کہ ہماری جسارتوں کی یہ "فاقہ مستی" اُس تعالیٰ کی جناب سے عذاب کی کسی شکل کا "رنگ" نہ لائے۔

نفاذِ شریعت کی ہر کوشش میں شرکت کو اپنا فرضِ عین جانتے ہوئے بھی ہم اس مرحلے پر عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ ہنگامہ ہاؤ ہو ہمارے موقف کی صداقت پر مہرِ تصدیق ثبت کر رہا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہ العالی اور تنظیم اسلامی نے ہر رنگ میں، ہر انداز سے، ہر منطق کے زور پر اور ہر دلیل کی روشنی میں روزِ اول سے یہ بات ڈنکے کی چوٹ کہی ہے کہ پاکستان میں نفاذِ اسلام کا خواب

---

[1] بقول اکبر الہ آبادی مرحوم
بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے اک مضمون لکھا — ملک میں مضمون نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

انتخابی سیاست سے نہیں بلکہ انقلابی عمل کے ذریعے ہی شرمندۂ تعبیر ہو سکے گا۔ احقاقِ حق ہوا، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو رہا ہے لیکن آہ کس قیمت پر!۔ پچھلے دنوں امیر جماعتِ اسلامی پاکستان، جناب میاں طفیل محمد صاحب مدظلہ العالی کا ایک مضمون اخبارات کی زینت بنا۔ جس میں انہوں نے اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے کے بعد نفاذِ شریعت کے مخالف حلقوں کو مخاطب کر کے افہام و تفہیم کی سعیٔ لاحاصل کی ہے۔ انہیں معلوم ہے اور ہم بھی جانتے ہیں کہ مخاطبین کے چکنے گھڑوں پر شبنم کی یہ بوندیں کیا اثر کرتیں لیکن کیا اب بھی اس کام کا وقت نہیں آیا کہ اکابرین و عمائدینِ جماعت اور ان کے حلقے کے مخلصین فی الدین اپنی حکمتِ عملی پر طریقِ نبوت اور سیرتِ مطہرہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی روشنی میں نظرِ ثانی کریں۔ ہم دست بدعا ہیں ــــ یا الٰہ العالمین، یا مُقلب القلوب! اس قوت کو کارزیاں میں نہ کھپنے دے بلکہ اس سے اپنے دین کی وہ حقیقی اور مؤثر خدمت لے جس کی نتیجے میں تیرا عطا کردہ ہمارا یہ وطن۔ پاکستان۔ گمرہی و ضلالت کے اندھیاروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتی انسانیت کے لئے مینارِ نور بن جائے ؏ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔

دفاعِ پاکستان اس وقت ہمارے لئے موت و زیست کا اوّلین مسئلہ ہے۔ ہم اپنی تاریخ کے نازک ترین موڑ پر ہیں۔ دشمن دانت تیز کر رہا ہے، پنجے رگڑ رہا ہے۔ ہمیں دو طویل محاذوں پر بڑی طاقتوں (SUPER POWERS) کا سامنا ہے۔ بھارت بھی اب ثانوی بڑی طاقت (MINI SUPER POWER) کہاں رہا۔ وہ خود بھی چھوٹی عفریت نہیں، روس سے معانقے کے بعد اُس کے بڑی طاقت بن جانے میں کیا شبہ رہ گیا۔ اسکے مقابلے میں ہماری کیفیت کیا ہے۔ من آنم کہ من دانم۔ دفاعی تیاریوں کی نازک تفاصیل ہمیں معلوم ہونی بھی نہیں چاہئیں کہ فوجی حکمتِ عملی کا تقاضا ہے۔ تاہم اس حد تک تو علم ہمارا حق بنتا ہے کہ ڈھارس بندھی رہے۔ لیکن ؏ رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند۔ ہمارے ملک میں یہ ریت ہی نہیں پڑی کہ عوام کالانعام کو اس قابل سمجھا جائے کہ جوابدہی کے احساس کے ساتھ انہیں اعتماد میں لینے کی ضرورت ہو۔ ہمیں تو سقوطِ مشرقی پاکستان سے متصلاً قبل ساتویں بیڑے کی نوید سے لوریاں دی گئیں تا آنکہ ؏ بیڑے یاروں کے دیکھا کئے سامنے ــــ ملک عزیز دولخت ہو گیا اور تاریخ اسلام کی بدترین شکست ہمارا مقدر ہوئی۔

مترِ دلبراں در حدیثِ دیگراں کا انداز مستعار لے کر ایک واردات کا ذکر کیا جا رہا ہے جس سے برادر مسلم ملک مصر دوچار ہوا تھا۔ اور جس میں بحیثیتِ قوم ہمارے لئے بڑی سبق آموزی ہے۔ کلّا انها تذکرۃ۔ اور اس روایت کی ثقاہت کا راقم بذاتِ خود ذمّہ دار ہے۔ جناب جنرل (ریٹائرڈ) فتحی رزق (تاحال قاہرہ میں سکونت پذیر ہیں۔ اللہ تعالےٰ انہیں سلامت رکھے) نے خود راقم کو یہ پوری روداد سنائی کہ چونکہ وہ بھی بلاواسطہ یا بالواسطہ جنرل نجیب اور کرنل ناصر مرحومین کے ساتھی تھے لہٰذا انقلاب کے بعد انہیں کوارٹر ماسٹر جنرل (Q.M.G.) کے عہدے پر ترقی دی گئی یا برقرار رکھا گیا۔ جس کے فرائض میں فوج کی جملہ رسد مع اسلحہ و گولہ بارود کی فراہمی اور انتظام و انصرام شامل ہوتا ہے۔ کرنل ناصر نے جنرل نجیب سے اختیاراتِ کلّی حاصل کرنے کے بعد جب اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے مزید اور جدید تر اسلحے کی ضرورت محسوس کی تو اُن کا رجحان طبعًا روس کی طرف تھا لیکن جنرل رزق کے اس اصرار پر کہ مغرب سے ہمیں بہتر مال ملے گا اُنہیں ہار ماننی پڑی۔ جنرل صاحب موصوف ایک وفد لے کر مغربی یورپ حتیٰ کہ امریکہ تک کی خاک چھان آئے لیکن وہ شاطر بقّال کرنل ناصر کے تیور بھانپ چکے تھے، صاف ٹکر گئے۔ یہ لوگ خالی ہاتھ آئے تو کرنل ناصر چاہتے یہی تھے۔ اُنہوں نے روس کا رُخ کیا اور جنرل رزق اور انکے ہم خیال گروپ کی اس درخواست کو خاطر میں نہ لائے کہ ہمیں مغرب کو قائل کرنے کا ایک موقع اور دیا جائے۔ نتیجہ سب کو معلوم ہے، مصر روس کا لے پالک بنا، روسی اسلحہ خانوں کے کوڑے کرکٹ اور روسی مشیروں کی فوج ظفر موج کی ریل پیل ہوئی [1]۔ اور پھر جون ۱۹۶۷ء میں جو ہوا وہ کسے یاد نہیں ؎

یادِ ماضی عذاب ہے یا ربّ — چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

صدر ناصر مغرب کے ساتھ بگاڑ میں اس سُرعت کے ساتھ پیشقدمی نہ کرتے اور روس سے اس حد تک پینگیں نہ بڑھاتے تو بنظرِ بظاہر آج حالات مختلف ہوتے۔ گویہ تقدیرِ الٰہی تھی تاہم تدبیر سے ہمارے رب نے منع تو نہیں فرمایا۔

---

[1] **جنرل فتحی رزق** سے گلو خلاصی کے لئے صدر ناصر نے انہیں وزیر پیداوار (MINISTER OF PRODUCTION) کے عہدہ پر "ترقی" دے دی تاکہ اس بہانے فوج سے انہیں فارغ کیا جا سکے اور پھر کچھ ہی دنوں بعد "بس اچھا" کر کے وہاں سے بھی چلتا کیا۔

موضوعِ زیرِ گفتگو اس درجہ نازک اور حسّاس ہے کہ سوائے یہ ایک آئینہ دکھانے کے ہم کچھ کہہ نہیں سکتے۔ اللہ تعالےٰ ہمارے اربابِ اختیار کو راہِ عدل و قسط پر مستقیم فرمائے۔ قوم پُلِ صراط عبور کر رہی ہے۔ صلاحیتِ حرب و ضرب کا حصول اور ایٹم اپنی جگہ نہ صرف بہت اہم بلکہ ہمارے رب کا حکم بھی ہے لیکن سب اہلِ دانش و بینش کا اس امر پر بھی اتفاق ہے کہ اندرونِ ملک ملّت میں اطمینان، اتفاق اور یک جہتی اور بیرونِ ملک ہوش مندانہ طرزِ عمل اس موقع پر شاید اوّل الذکر سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ اس کے لئے کیا کچھ کیا جا رہا ہے — نظر تو کچھ آتا نہیں۔ اللہ تعالےٰ خیر کرے۔ تاہم مصوّرِ پاکستان بہت پہلے کہہ گئے ہیں کہ ؎ ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات۔ یہ ایک اصول (RULE) ہے لیکن اللہ تعالےٰ کو اگر اپنی کسی وسیع تر حکمت کے تحت اس مُلک کا بقا مطلوب ہے تو وہ حسبِ سابق اسے اِستثناء (EXCEPTION) بنانے پر قادر ہے۔

"میثاق" ایک طویل عرصے سے جیسا کچھ مقدور ہوا، دین کی خدمت کئے چلا آ رہا ہے۔ ادارے کی کوتاہیوں کے باوجود اس کی اشاعت اکثر دینی جرائد سے کہیں زیادہ ہے۔ فللہ الحمد۔ اب اسکی اشاعت میں باقاعدگی پیدا کرنے، کتابت و طباعت کا معیار بڑھانے اور بہتر کاغذ استعمال کرنے کی کوشش بھی مؤقر قارئین کے سامنے ہے۔ تاہم اشتہارات کی کمیابی (کہ یہ پرچہ کمرشل تو کبھی بھی نہ تھا) عام گرانی اور بالخصوص کاغذ کی روز افزوں قیمتوں نے ادارے کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ اس بوجھ کو کم کرنے کے کارِ خیر میں آپ درج ذیل صورتوں میں تعاون مطلوب ہے۔ فجزاکم اللہ احسن الجزاء۔

۱۔ اس کی فی پرچہ قیمت پانچ روپے اور زرِ سالانہ پچاس روپے از جنوری ۱۹۸۸ء خوشدلی سے قبول فرمائیے۔

۲۔ اس کی توسیعِ اشاعت میں دل و جان سے کوشش فرمائیے۔ بالخصوص سالانہ خریدار زیادہ سے زیادہ پیدا کیجئے کہ یہ پرچے کے لئے بمنزلۂ ریڑھ کی ہڈی ہیں۔

۳۔ اپنے حلقۂ اثر میں سے اس کیلئے سنجیدہ و متین اور بلا تصویر (جاندار) اشتہارات حاصل کیجئے — نرخنامہ اشتہارات دفتر سے عند الضرورت طلب کیا جا سکتا ہے

بارِ خاطر نہ ہو تو آخر میں چند کلمات راقم اپنے بارے میں بھی عرض کر کے قارئین کرام سے دُعاؤں کا طالب ہے۔ برادرِ بزرگ جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی عدم موجودگی[1] میں یہ چند صفحات گھسیٹنے کی ذمہ داری مجھ پر آن پڑی۔ ربع صدی قبل لکھنے پڑھنے کا کچھ تھوڑا بہت شغل کیا تھا، پھر جو قلم ہاتھ سے رکھا تو وہ اب جا کر صفحۂ قرطاس پر سجدہ ریز ہوا ہے۔ یہ بھی کسی مالی منفعت یا شوق پورا کرنے کی غرض سے نہیں۔ ولولے اور ارمان بہت پورے ہو چکے۔ اللہ بس باقی ہوس۔ صرف ایک فرض کی ادائیگی مقصود ہے۔ دُعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ میرے قلم کو روانی عطا کرے اور اسے اپنے دین کی خدمت میں قبول فرمالے۔ رَبِّ وَفِّقْنِیْ لِمَا تُحِبُّ وَ تَرْضٰی۔ ربنا تقبل منا انك انت السمیع العلیم وتب علینا انك انت التواب الرحیم۔

'میثاق' کے موقر قارئین رفیقِ محترم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کے اندازِ نگارش اور عزیزی حافظ عاکف سعید کی تحریروں سے لطف اندوز ہوتے رہے ہیں۔ میں وہ بات تو پیدا نہیں کر سکتا بالخصوص اس حال میں کہ ایک بڑے صدمے کے اثرات دل و دماغ پر ابھی تازہ ہیں[2]۔ تاہم اپنی سی کوشش کی ہے۔ گر قبول افتد زہے عزّ و شرف۔ قارئینِ کرام میرے قلم کی فروگذاشتوں اور ناپختگی سے صرفِ نظر فرمائیں تو احسان ہوگا۔

---

[1] ڈاکٹر صاحب موصوف سعودی عرب میں مقیم ہیں اور اپنی کتاب "استحکام پاکستان" کے تتمے "پاکستان میں اسلامی انقلاب: کیا، کیوں اور کیسے!!!" کا خاکہ تیار کر رہے ہیں۔ یاد ہوگا کہ خود "استحکام پاکستان" کا نقشہ بھی انہوں نے سال گذشتہ اسی ارضِ مقدس میں بیٹھ کر بنایا تھا۔ نئی کتاب ان شاء اللہ جلد آپ تک پہنچ جائے گی۔ موصوف کی صحت اور یک سوئی کے لئے خصوصی دُعا کی درخواست ہے۔

[2] ۲۰ ستمبر ۸۶ء کو ٹریفک کے جانکاہ حادثے میں عزیزان عبداللہ طاہر سیال اور محمد حمید احمد کی جواں مرگی کا صدمہ، جس کا تفصیلی ذکر اکتوبر کے عرضِ احوال میں برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے قلم سے آچکا ہے۔

استحکام پاکستان (حصہ دوم)

پاکستان میں اسلامی انقلاب

کیا ——— ؟
کیوں ——— ؟
اور
کیسے ——— ؟

اسرار احمد

مکہ مکرمہ: ۹ نومبر ۱۹۸۶ء

دلیلِ صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی!
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی ذہنِ ہندی نطقِ اعرابی

اڑا کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل
"نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی"

غبار آلودہِ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پر فشاں ہو جا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو، زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا

اقبالؔ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱) تقدیم

'استحکامِ پاکستان' کی تحریر و تسوید کا آغاز اکتوبر ۸۵ء (صفر المظفر ۱۴۰۶ھ) میں بمقام طائف ہوا تھا اور اُس کی آخری سطریں ۱۷ فروری ۸۶ء کو بمقام لاہور سپردِ قلم ہوئی تھیں۔

اُس وقت صرف 'خیال' ہی نہیں پختہ ارادہ تھا کہ اُس کے دوسرے حصّے کی تالیف بھی فوراً ہی شروع کر دی جائے گی۔ چنانچہ کتاب کے آخر میں اس کا وعدہ بھی کر لیا گیا تھا۔ لیکن مختلف النوع مستقل مصروفیات پر مستزاد بعض اچانک اور غیر متوقع حادثات کے باعث اس میں تاخیر ہوتی چلی گئی۔

اُدھر اوّل تو روزنامہ 'جنگ' کے جملہ ایڈیشنوں میں اشاعت کی بنا پر اس کے مضامین پہلے ہی بہت وسیع حلقے میں پھیل چکے تھے۔ پھر کتاب بھی نہایت قلیل مدت میں کثیر التعداد لوگوں تک پہنچ گئی۔ لہٰذا فطری طور پر موعودہ حصّہ دوم کے لیے تقاضا شدید ہو گیا خصوصاً اس بنا پر کہ خود راقم نے کتاب کا اختتام ان الفاظ پر کیا تھا:

"ہماری اب تک کی کُل گذارشات کا لبِّ لباب اور حاصلِ کلام صرف یہ ایک جملہ ہے کہ: 'پاکستان کے استحکام کا واحد ذریعہ اسلامی انقلاب ہے' اور اسی پر ہم اس کتاب کو ختم کر رہے ہیں۔

اس مرحلے پر ایک نہایت اہم اور بنیادی سوال یہ سامنے آتا ہے کہ وہ اسلامی انقلاب کیسے آئے گا؟ اس کے اساسی لوازم کیا ہیں؟ بنیادی طریقِ کار کیا ہے؟ اور تکمیلی اقدامات کیا ہوں گے؟ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اِن امور کی بھی تفصیلی وضاحت کی ضرورت ہے کہ اسلامی انقلاب سے مراد کیا ہے؟ اور اس کے نتیجے میں جو سماجی، معاشی اور سیاسی نظام وجود میں آئے گا اس کے اہم خدوخال کیا ہوں گے؟"

اِن حالات میں ایک ہی صُورت ممکن العمل نظر آئی اور وہ یہ کہ دوبارہ ارضِ مقدّس ہی کا قصد کیا جائے اور وہیں "البلد الامین" کے کسی گوشے میں بیٹھ کر تحریر کا آغاز کر دیا جائے ——— پھر تکمیل ان شاء اللہ حسب سابق پاکستان میں بھی ہو جائیگی۔

اللہ کا شکر ہے کہ اُس نے اپنے کمال فضل و کرم سے یہ ارادہ پورا کرا دیا اور حضرتِ اکبرؔ کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

منتشر رہتا ہے مکروہاتِ دنیا سے بہت　　اس دلِ مضطر کو یا اللہ اطمینان دے!

کتاب کی تحریر و تسوید کے لیے جس امن و سکون کی ضرورت تھی وہ حرمِ مکّی میں میسّر آ گیا، بقول اقبالؔ ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی　　مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں!

چنانچہ ——— آج بروز شنبہ بتاریخ ۹ نومبر ۸۶ء (سعودی عرب کے حساب سے ۷ ربیع الاوّل ۱۴۰۷ھ) بمقام مکّہ مکرّمہ محض اللہ کی تائید و توفیق کے بھروسے پر قلم ہاتھ میں لے لیا ہے ——— اس دعا کے ساتھ کہ 'پروردگار! مجھے شرحِ صدر کی دولت عطا فرما، میرے کام کو میرے لیے آسان فرما دے اور میری زبان (اور قلم) کی گرہ کھول دے تاکہ (میرے ہم وطن اور ہم مذہب) لوگ میری بات کو سمجھ سکیں' گویا بقول اقبالؔ ؎

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو　　میں ہوں خذف تو تُو مجھے گوہر شاہوار کر!

سب جانتے ہیں کہ راقم الحروف نہ مصنّف و مؤلف ہونے کا مدّعی ہے، نہ ادیب اور انشا پرداز ہونے کا دعویدار۔ بنا بریں اصحابِ نظر سے توقع ہے کہ وہ لغت و ادب کی غلطیوں اور انشاء اور اسلوب کی خامیوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے توجّہ کو بالکلیّہ مفہوم و مدّعا ہی پر مرکوز رکھیں گے۔ مبادا مجھے بھی اپنے بزرگوں اور عزیزوں سے علّامہ اقبالؔ کے الفاظ میں شکوہ کرنا پڑے کہ ؎ "مرا یاراں غزلخوانے شمردند!"

وَما توفیقی اِلّا باللہِ العلیِّ العظیم!

فرمانِ نبویؐ مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَا یَشْکُرُ اللّٰہَ کے مطابق مجھ پر شکریہ واجب ہے جناب یحییٰ عبدالشکور منشی صاحب کا جنہوں نے جدّہ میں قیام کی اعلیٰ ترین سہولتیں مہیا کیں اور مدینہ منوّرہ کے سفر میں ہمرکابی بھی اختیار کی اور میسرز شہباز نذیر سعودیہ لمیٹڈ کا جنہوں نے مکّہ مکرّمہ میں قیام کی سہولت کے علاوہ حرم کی حاضری کے لیے ہمہ وقت کار بھی فراہم کیے رکھی۔ فَجَزَاھُمُ اللّٰہُ اَحْسَنَ الْجَزَاءِ۔

---

(۲) پاکستان کے عدمِ استحکام کی نئی جہتیں

اُس کتاب کے پہلے حصّے میں تفصیل کے ساتھ واضح کیا جاچکا ہے کہ پاکستان کا عدمِ استحکام ؏ "یہ ہوائی کسی دشمن نے اُڑائی ہوگی" کے مصداق وہمی اور خیالی نہیں بلکہ حقیقی اور واقعی ہے اور اس میں اغیار اور اعداء کی ریشہ دوانیوں سے کہیں زیادہ دخل ہماری اپنی کوتاہیوں اور نااہلیوں کو ہے جن کی اصل جڑ اور بنیاد یہ ہے کہ ہم نے پاکستان جس مقصد کے لیے حاصل کیا تھا اُس کی جانب کوئی حقیقی اور واقعی' اور مؤثر اور نتیجہ خیز پیشقدمی نہیں کی (یعنی اسلام کی جانب کوئی قدم اٹھایا بھی تو محض علامتی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کی نوعیت کا) بلکہ ہم ہمہ تن آزادی کی مادّی برکات سے بہرہ اندوز ہونے میں منہمک ہو گئے۔ اور اس کے ضمن میں مقابلہ و مسابقت اور تنافس و تکاثر نے بالکل دھاپا دھاپی' اور افراتفری (FREE FOR ALL) کی کیفیت پیدا کر دی —— نتیجۃً ہماری وحدتِ ملّی پارہ پارہ ہوگئی اور اس کی جگہ گروہی و طبقاتی، صوبائی و علاقائی اور نسلی و لسانی عصبیتوں کا دَور دَورہ ہوگیا۔

ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ رہی ہے اور ہر قلبِ حسّاس مضطرب ہے کہ گذشتہ ایک سال کے دَوران یہ کیفیت دو جمع دو چار نہیں بلکہ چار ضرب چار سولہ کے حساب سے بڑھی ہے۔ گویا بقول شعری ؏ "ترقی پہ ہے اضطرابِ محبت!"

چنانچہ وطنِ عزیز کے مختلف حصوں میں گذشتہ ایک سال کے دوران بالعموم اور پچھلے تین ماہ کے دوران بالخصوص جو حالات و واقعات رُونما ہوئے ہیں انہوں نے واقفانِ حال اور صاحبانِ احساس کی تشویش میں تو حد درجہ اضافہ کیا ہی ہے، بہت سے قلندرانِ "حال مست" اور بے پرواپانِ "مال مست" کو بھی پریشان کر دیا ہے ـــــ اور اس وقت ہر پاکستانی مسلمان خواہ امیر ہو یا غریب، پڑھا لکھا ہو یا اَن پڑھ اور بڑا ہو یا چھوٹا ملک و ملّت کے بارے میں شدید اندیشہ محسوس کر رہا ہے ـــــ یہاں تک کہ وہ "نفسِ مطمئنہ" اور بقولِ خود "مقتدرِ اعلیٰ" بھی جو سرکاری تقریبات میں مسکراہٹوں کے پھول بکھیرتا اور لطیفوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتا ـــــ گویا نیرو کے مانند بنسی بجاتا نظر آتا ہے ـــــ اور اس طرح ہر ممکن طریقے سے 'سب اچھا ہے!' کا تاثر دیتا ہے پہلی بار یہ کہنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ "حالات واقعۃً تشویشناک ہیں"! اگرچہ اس فوری اضافے کے ساتھ کہ "مگر اِن کا علاج تازہ الیکشن ہرگز نہیں ہے"! گویا اطمینان کی اصل اساس وُہی ہے کہ ع "ہنوز دِلّی دُور است"! اور اسی بنا پر ع "ایں دفترِ بے معنیٰ غرقِ مۓ ناب اولیٰ"! کی روش پر اصرار ہے!

تو آئیے کہ ذرا پاکستان کے حالات پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر جائزہ لیں کہ پاکستان کے چاروں صوبے کس حال میں ہیں اور پاکستان کی سالمیّت کی فصیل میں کہاں کہاں دراڑیں پڑ رہی ہیں:

سرحد

پاکستان کی شمال مغربی سرحد پر رُوس اور اُس کی کٹھ پتلی افغان حکومت کی جانب سے فضائی خلاف ورزیوں کا سلسلہ تو کئی سال سے جاری ہے، اِس سال کے دوران براہِ راست بمباری کے بھی متعدد واقعات ہوئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ 'جوابِ آں غزل' کا وہ عمل بالفعل شروع ہو گیا جس کی دھمکی کئی سال سے دی جا رہی تھی۔ چنانچہ ایک طرف پاکستان کے قبائلی علاقے میں روسی عمل دخل اور اثر و نفوذ کا سلسلہ پُوری شدّت کے ساتھ

شروع ہوگیا اور روسی ہتھیاروں اور اسلحہ کی بھرمار ہوگئی اور دوسری جانب ایک قبائلی سردار اور اس کے حواریوں کے ذریعے 'جوابی ہجرت' کا ڈرامہ بھی رچا لیا گیا، خواہ وہ محض ایک 'علامت' (SYMBOL) کے درجے ہی کی تھی۔

اس پر مستزاد یہ کہ بموں کے دھماکے اور دوسری تخریبی سرگرمیاں اب پشاور اور اس کے گردونواح کے علاقے کا معمول بن گئی ہیں اور اس علاقے کی صورتِ حال کی بالکل صحیح تعبیر ہے جو ایک حال ہی میں فوت ہونے والے سیاسی کارکن سے منسوب اِن الفاظ میں سامنے آئی ہے کہ "پشاور کا علاقہ بیروت نہیں بارود بن رہا ہے!" ——— اِسی طرح افغان تخریب کاروں اور دہشت گردوں کی گرفتاری اور مہلک اسلحہ اور تباہ کن ساز و سامان کی برآمدگی کی خبریں اب جس تسلسل سے آرہی ہیں اُس کے پیشِ نظر یہ سوال ذہن میں بار بار اُبھرتا ہے کہ "اگر یہ سارا سامان استعمال ہو جاتا تو کیا ہوتا؟" ——— اور اس کے ساتھ ہی تحت الشعور میں یہ اندیشہ بھی سر اٹھاتا ہے کہ "یہ برآمدگیاں برف کے سمندری تودے (ICEBERG) کی صرف سطحِ سمندر سے اُوپر نظر آنے والی چوٹی (TIP) کی حیثیت رکھتی ہیں!" گویا ع "قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا!"

اس پوری صورتِ حال پر تو یہ کہہ کر صبر کیا جا سکتا تھا کہ یہ سب کچھ افغان مہاجرین کو پناہ دینے اور مجاہدین افغانستان کے لیے کم از کم بیرونی امداد کے راستوں کو کھلا رکھنے کی قیمت ہے جو ہمیں بہرصورت ادا کرنی ہوگی۔ اس لئے کہ مسلمان مہاجرین کو پناہ دینا ہمارا دینی اور اخلاقی فرض ہے ——— اور افغان مجاہدین صرف اپنے ملک کی آزادی ہی کے لیے نہیں لڑ رہے ہیں بلکہ مارکسی اِلحاد اور رُوسی استبداد کے سیلاب کی راہ کا کوہِ گراں بن کر خود پاکستان کے دفاع کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ لہٰذا بات اگر صرف اس حد تک ہوتی تو ہرگز تشویشناک نہ ہوتی لیکن اس کے ساتھ ساتھ جب یہ بھی نظر آتا ہے کہ خان عبدالولی خاں کابل اور روس میں بیٹھ کر پوری بے باکی کے ساتھ نہ صرف یہ کہ پاکستان کی پالیسیوں پر تنقید کرتے ہیں بلکہ کھلم کھلا الزام عاید کرتے ہیں کہ پاکستان بھارت کے سکھ دہشت گردوں کی مدد کر رہا ہے ——— اور اس سب کے

بعد پورے اطمینان اور نہایت آن بان کے ساتھ میلوں لمبے استقبالی جلوس کے جلو میں پاکستان واپس تشریف لے آتے ہیں اور انہیں کوئی اندیشہ نہیں ہوتا کہ ملک میں اُن سے کوئی باز پُرس ہو سکتی ہے ——— تو لازماً تشویش ہوتی ہے کہ ہماری حکومت نے فضائی اور سرحدی خلاف ورزیوں کے معاملے میں تو اُس روایتی بنیے کا کردار جو ہر مرتبہ مار کھانے کے بعد یہی کہا کرتا تھا کہ "اب کے مار کے دیکھ" اس لیے اختیار کیے رکھا کہ رُوس ایسی سُپر پاور سے براہِ راست تصادم سے امکانی حد تک گریز کرنا چاہیے لیکن کیا وہ اس درجہ لاچار اور بے بس ہو چکی ہے کہ خود اپنے شہریوں سے باز پُرس نہیں کر سکتی! مزید برآں کیا عوامی سطح پر ہمارا جسدِ ملّی اتنا بے جان ہو چکا ہے کہ اس کے خلاف صریح جارحیّت پر بھی کسی عوامی ردِّ عمل کا اندیشہ نہیں ہوتا! ——— اسی طرح جب وہ صاحب بھی جو جناب ضیاء الحق کے جاری کردہ 'نیم سیاسی' عمل کے ذریعے صوبہ سرحد کی وزارتِ علیا کے عہدے پر فائز ہوئے ہیں نہ صرف یہ کہ مجوّزہ کالا باغ ڈیم کے بارے میں بالکل وہی بات کہتے ہیں جو جناب سرحدی گاندھی اور اُن کے فرزندِ ارجمند اور جناب جی ایم سیّد اور اُن کے حواری کہتے ہیں بلکہ صوبائی حقوق و اختیارات کے ضمن میں کنفیڈریشن کا نعرہ لگانے والوں سے بھی دو ہاتھ آگے نکل جاتے ہیں تو لازماً خوف لاحق ہوتا ہے کہ کیا واقعتہً سرحد کا وہ غیور پٹھان جس نے چالیس سال قبل ریفرنڈم میں انڈین نیشنلزم کے علمبرداروں کو عبرتناک شکست دی تھی کسی ردِّ عمل کا شکار ہو کر علاقائیت اور صوبائیت کے خول میں بند ہو چکا ہے!!

پنجاب

آبادی کے لحاظ سے پنجاب پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے ——— اور غالباً یہ اسی 'بڑے پن' کے احساس کا نتیجہ ہے کہ وہاں کے لوگ اکثر و بیشتر اپنے آپ ہی میں مگن رہتے ہیں اور "اندیشہ ہائے دُور و دراز" میں بآسانی مبتلا نہیں ہوتے، جس کے نتیجے میں "بدگمانی ہے عبث میری خموشی سے تمہیں!" کے مصداق چھوٹے صوبوں کے لوگوں کو کچھ بدگمانیاں فطری

طور پر لاحق ہوتی ہیں جنہیں ملک وملّت کے دشمن سہ "کچھ تو ہوتے بھی ہیں الفت میں جنوں کے آثار۔ اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا لیتے ہیں۔" کے مطابق بڑھا چڑھا اور نمک مرچ لگا کر اپنے مذموم مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ چھوٹے صوبوں میں یہ خیال عام پایا جاتا ہے کہ چونکہ پنجاب بہت خوشحال ہے اور اس خوشحالی میں اُس کے اپنے داخلی وسائل و ذرائع اور اس میں بسنے والوں کی محنت ومشقت یا اہلیّت ولیاقت سے زیادہ حصّہ دوسرے صوبوں کے 'استحصال' کا ہے لہٰذا وہاں ـــــ "سب اچھا" کا سماں بندھا رہتا ہے ـــــ حالانکہ واقعہ یہ ہے پاکستان کی صنعتی اور تجارتی دولت کا سب سے بڑا ارتکاز کراچی میں ہے اور ہر قسم کے پیسے کی سب سے زیادہ ریل پیل صوبہ سرحد میں ہے، پھر استحصالی طبقات جیسے کچھ اور جتنے کچھ پاکستان کے دوسرے صوبوں میں موجود ہیں ویسے اور اتنے ہی پنجاب میں بھی ہیں اور محنت کش عوام، خواہ وہ ادنیٰ اور متوسط طبقے کے ملازمت پیشہ لوگ ہوں خواہ مزدوروں اور کاشتکاروں کے طبقے سے تعلق رکھتے ہوں جیسے اور جتنے دوسرے صوبوں میں ظلم وستم کی چکّی میں پس رہے ہیں ویسے ہی اور اُتنے ہی پنجاب میں بھی پس رہے ہیں۔ اور اگرچہ اس اِمکان کی نفی نہیں کی جاسکتی کہ سب سے بڑا صوبہ ہونے کے ناطے پنجاب کے استحصالی طبقات نے خود اپنے صوبے کے پسماندہ عوام کے استحصال کے ساتھ ساتھ دوسرے صوبوں کا بھی استحصال کیا ہو تاہم پوری پنجابی قوم کو استحصالی قرار دے دینا یقیناً زیادتی ہے جبکہ عمومی سکوت وسکون اور سیاسی جمود وتعطّل پنجاب کا مجموعی وصف ہے!

پنجاب کے اس عمومی اور مجموعی وصف کے اصل اسباب کا سراغ لگانے کے لیے تو پنجاب کے طویل تاریخی پس منظر میں جھانکنا ہوگا۔ پاکستان کے موجودہ سیاسی تناظر میں اہل پنجاب کی "بے حسی" کا سبب اوّلاً تو 'بڑائی' کا وہ احساس ہے جس کا ذکر اوپر ہوچکا ہے اور جو فی نفسہٖ بہت سرور انگیز اور نشہ آور ہے اور ثانیاً یہ کہ آخر وہ ایجی ٹیشن کریں تو کس کے خلاف ؟ دُہائی دیں تو کس کی ؟ اور علیحدگی چاہیں تو کس سے ؟ اس لیے کہ یہاں تو معاملہ وہ ہے کہ ع "اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست !" اور ؎

"دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی!"

اور یہ "دوست" کون ہیں؟ اوّلاً پاکستان کی مرکزی سول بیوروکریسی، جس میں ابتداءً ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے آنے والے (مہاجرین) اور پنجاب سے تعلق رکھنے والے تقریباً برابر کے شریک تھے اور صوبۂ سرحد کا حصّہ بھی بقدر حبّۃ موجود تھا جبکہ باقی دو صوبوں کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ لیکن جیسے جیسے وقت گذرا مہاجرین کا تناسب کم ہوتا چلا گیا اور مرکزی بیوروکریسی میں غالب اور فیصلہ کن اکثریت اہل پنجاب ہی کی ہوتی چلی گئی! اور ثانیاً پاکستان کی افواج ——— جن کے جوان، تو تقریباً کُل کے کُل پنجاب بلکہ اُس کے بھی صرف دو ڈویژنوں سے تھے، رہے آفیسرز، تو اُن کی بھی غالب اکثریت پنجاب سے تھی، اس کے بعد سرحد سے اور کسی قدر مہاجرین میں سے۔ گویا سندھ اور بلوچستان دونوں صوبوں کی پاکستانی افواج میں کوئی نمائندگی نہ تھی۔

واضح رہے کہ یہاں نہ کسی کے معائب و محاسن کا میزانیہ (BALANCE SHEET) مرتب کرنا مقصود ہے، نہ کسی طبقے کو مطعون (CHARGE SHEET) کرنا مطلوب ہے بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ پاکستان کے موجودہ سیاسی و انتظامی انتشار (CHAOS) اور ملّی و ملکی اضمحلال و تزلزل (SHAKINESS) میں کون کون سے طبقات کے کس رویّے کے منفی اثرات کو دخل حاصل ہے، لہٰذا پاکستان کی مرکزی حکومت کے اعلیٰ سطح کے ملازمین اور پاکستان کی افواج کے جوانوں اور افسروں کی خدمات اور اُن کی شاندار کارکردگی کا ذکر نہیں کیا جا رہا ہے ورنہ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ایک نوزائیدہ مملکت جو انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں قائم ہوئی تھی اس کو ابتداءً مستحکم کرنے اور داخلی فتنوں اور خارجی حملوں سے بچا کر اپنے پاؤں پر کھڑا کر دینے میں ان دو طبقات کی محنت و مشقت اور لیاقت و قابلیت کو فیصلہ کُن دخل حاصل ہے۔

موضوعِ زیرِ بحث کے اعتبار سے جس حقیقت کی جانب توجہ دلانی مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان کی اوّلین مرکزی بیوروکریسی نے چونکہ نوآبادیاتی نظام میں افسری کی تربیت پائی تھی لہٰذا چند مستثنیٰ مثالوں کو چھوڑ کر اس میں رعونت ہی نہیں فرعونیت بھی تھی اور حاکمانہ ہی نہیں تحکمانہ ذہنیت بھی، جس کا شدید ردِّ عمل پیدا ہوا اوّلاً مشرقی پاکستان میں اور ثانیاً

بالخصوص وَن یُونٹ کے دَور میں مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبوں بالخصوص سندھ میں! نتیجتہً اوّلاً مشرقی پاکستان کے ہندوؤں اور ان کے نام نہاد مسلمان ایجنٹوں کو پورے مغربی پاکستان کے خلاف جذبات بھڑکانے کا موقع ملا اور بنگلہ دیش کے قیام کی راہ ہموار ہوگئی! اس لیے کہ اس وقت تک سنٹرل سِول سروس میں پنجابیوں کے ساتھ ساتھ مہاجروں کی بھی معتدبہ تعداد موجود تھی ——— اور بعد ازاں یہی صورت مغربی پاکستان میں پیدا ہوئی جس کے نتیجے میں سندھی اور بلوچ عوام میں پنجابیوں کے خلاف شدید نفرت کا جذبہ پیدا ہوگیا اس لیے کہ اب سنٹرل سروسز میں پنجابیوں کو فیصلہ کن اکثریت حاصل ہو گئی تھی! پنجاب کے خلاف یہ عمومی ردّعمل اگرچہ کسی درجہ میں سرحد میں بھی پیدا ہوا - اور اس سے کسی قدر زائد بلوچستان میں بھی (یاد ہوگا کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت العلماء کی جو کولیشن حکومت بلوچستان میں بنی تھی اس نے تمام پنجابی افسروں کو ایکدم پنجاب واپس جانے کا حکم صادر کر دیا تھا) لیکن اس نفرت کا سب سے بڑا گڑھ سندھ بنا!

اور اس میں ہرگز کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ نفرت کی اس جلتی آگ پر تیل ہی نہیں پٹرول کا کام کیا بار بار لگنے والے مارشل لا نے اور اس کیفیت (PHENOMENON) کو منطقی انتہا تک پہنچا دیا جنرل ضیاء الحق کی طویل ترین فوجی حکومت نے جس سے پاکستان تا حال بھی کلّی طور پر رُستگاری حاصل نہیں کر سکا ہے! نتیجتہً آج 'پنجابی' کا لفظ پاکستان کے تینوں چھوٹے صوبوں میں بالعموم اور سندھ میں بالخصوص 'گالی' کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور پاکستان بالفعل اُس خوفناک تباہی کے دہانے تک پہنچ گیا ہے جس کا اندیشہ راقم الحروف نے اپنے اُس خط میں ظاہر کیا تھا جو اُس نے اب سے ٹھیک چار سال قبل (دسمبر ۸۲ء میں) جنرل ضیاء الحق صاحب کی خدمت میں ارسال کیا تھا اور جو بعد ازاں روزنامہ 'جنگ' میں بھی (کسی قدر قطع وبرید کے ساتھ) شائع ہوگیا تھا اور ماہنامہ 'میثاق' میں بھی!

اپنے اُس خط میں راقم نے اپنا یہ مشاہدہ بھی بیان کیا تھا کہ:

"میرے اندازے میں سندھ میں 'سندھو دیش' کے لیے میدان پورے طور پر بالکل اسی طرح تیار ہو چکا ہے جس طرح مشرقی پاکستان میں 'بنگلہ دیش' کے لیے ہوا تھا - اور اب فرق صرف اتنا

ہے کہ چونکہ مشرقی پاکستان ہم سے دُور اور علیحدہ تھا اس لیے مرکزی حکومت وہاں مؤثر کنٹرول نہ کر سکی اور سندھ چونکہ زمینی طور پر ملحق ہے لہٰذا یہاں ایسی کسی تحریک کو کچلا جا سکتا ہے۔
لیکن میرے نزدیک اس عامل (FACTOR) پر انحصار سخت عاقبت نا اندیشی ہے!"

اور اس کے ساتھ پوری وضاحت سے متنبّہ کیا تھا کہ 'مارشل لاء کی طوالت اور سیاسی عمل کے مسلسل تعطل سے قومی و ملّی زندگی میں جو خلاء (VACUUM) پیدا ہوا ہے وہ پاکستان کے حق میں خودکشی کے مترادف (SUICIDAL) ہے، دوسری طرف 'اسلام' جس کے نام پر آپ ملک کی سیاسی گاڑی کو روکے کھڑے ہیں، اُس کے ضمن میں نہ صرف یہ کہ آپ نے ساڑھے پانچ سال کے عرصے میں کوئی مثبت اور نتیجہ خیز پیشقدمی نہیں کی بلکہ آپ کے بعض نیم دلانہ اقدامات نے اسلام کے CAUSE کو اُلٹا نقصان پہنچایا ہے۔ بنابریں جلد از جلد مارشل لاء کی بساط لپیٹیے اور ملک کی سیاسی گاڑی کو جمہوری خطوط پر آگے بڑھنے کا موقع دیجیے ——— اس ضمن میں راقم نے بہ "نوا را تلخ ترمی زن چوں ذوقِ نغمہ کم یابی!" کے مطابق یہاں تک عرض کر دیا تھا کہ:

"مجھے شدید اندیشہ ہے کہ کہیں مستقبل کا مورّخ یہ نہ لکھے کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے نام سے عہدِ حاضر کی جو سب سے بڑی مسلمان مملکت قائم ہوئی تھی اسے اوّلاً ۱۹۷۱ء میں دولخت کیا ایک شرابی اور زانی لوٹے نے اور بعد ازاں اس کے مزید حصّے بخرے ہوئے (یعنی (BALKANISATION) کا عمل صادر ہوا ایک ایسے شخص کے ہاتھوں جو نمازی اور پرہیزگار تھا!"

قصہ مختصر یہ کہ پنجاب کے حصّے میں جو بدنامی آئی وہ اصلاً تو بیوروکریسی کے غلط رویے اور مارشل لاء کے تسلسل اور طوالت کی پیداوار ہے، اگرچہ اس سے قطع نظر کہ صحیح حقائق و واقعات تو اللہ ہی کے علم میں ہیں، بہر حال نظری طور پر اس امکان کو ردّ نہیں کیا جا سکتا کہ پنجابی افسر شاہی اور مارشل لاء حکام کی بدعنوانیوں کے طفیل پنجاب کے کچھ لوگوں یا چند خاندانوں نے ناجائز فائدے بھی حاصل کیے ہوں لیکن پاکستان کے مستقبل کے اعتبار سے جو چیز نہایت تشویشناک ہے وہ یہ کہ پاکستان کے اندرونی معاملے اور بین الصوبائی مقدّمے میں ملک کا سب سے بڑا صوبہ 'مدعا علیہ' کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ جس کے نتیجے میں

پنجاب کی عوامی نفسیات پر مدافعانہ، رنگ غالب آگیا ہے اور حرکت و اقدام سے گریز پنجاب کی طبیعتِ ثانیہ بن گئی ہے۔ چنانچہ وہاں جو حرکت بالعموم نظر آتی ہے وہ سفر چہروں پر جو سُرخی نظر آتی ہے سرِ شام۔ یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات! کے مصداق اکثر و بیشتر صرف 'شغل میلہ' کی نوعیّت کی ہوتی ہے۔ ورنہ کسی سنجیدہ سماجی یا سیاسی تحریک میں پنجاب صرف اس وقت شامل ہوتا ہے جب کوئی دوسرے لوگ اُسے شروع کر کے نقطۂ عروج کے قریب تک پہنچا دیں۔

یہی وجہ ہے کہ ۱۹۸۳ء کی ایم آر ڈی کی تحریک پنجاب میں بالکل ناکام ہو گئی تھی نتیجتاً اس نے صرف سندھ اور اس کے بھی دیہی علاقے کی شورش کی صورت اختیار کر لی۔ پھر آنسہ بے نظیر بھٹو کی آمد پر پنجاب میں استقبال کا 'شغل میلہ' تو بھرپور انداز میں ہوا لیکن ۱۴ اگست ۱۹۸۶ء کو مختصر سی ہل چل کے سوا پنجاب میں کوئی عوامی تحریک نہیں چلی اور ایک مرتبہ پھر سندھ کے بعض دیہی علاقے ہی کل ہنگامے کا مرکز بن کر رہ گئے۔ اور اگرچہ اس حالیہ ناکامی کے بعد مس بھٹو نے بہت ٹھنڈے اور حقیقت پسندانہ طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا ہے اور وہ پوری سنجیدگی اور تندہی کے ساتھ خاص طور پر پنجاب میں اپنی تنظیم کی صفوں (CADRES) کو درست اور منظم کرنے کی کوششوں میں لگی ہوئی ہیں۔ تاہم ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ مستقبل قریب میں پنجاب کو جمہوریت کی کلّی و کامل بحالی کے لیے کسی مؤثر سیاسی تحریک کے لیے آمادہ کیا جا سکے گا یا نہیں! اور جیسے کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے پنجاب کا یہ سیاسی جمود اور قوم و وطن کے عظیم تر معاملات کے ضمن میں بے حسی اور لاتعلقی (INDIFFERENCE) کی روش پاکستان کے مستقبل کے لیے فی نفسہٖ بھی مُضر اور خطرناک ہے۔ اس لیے کہ چھوٹے صوبوں کے عوام میں اس کی بنا پر پنجاب سے عمومی مایوسی اور بدظنی پیدا ہو رہی ہے اور خصوصاً سندھ میں تو اس کا ردِّ عمل بہت شدید ہے ——— مزید برآں اس کا بھی شدید خطرہ موجود ہے کہ اگر پنجاب کسی طرح حرکت میں نہ آیا تو مس بھٹو اور ان کی پیپلز پارٹی کا سندھی حصّہ بھی قومی سیاست کے میدان سے پسپائی کر لیں اور صوبائیت کے خول میں بند ہو کر سندھی نیشنلزم کے تیز

دھارے میں نہ بہہ جائیں۔ اور اگر خدانخواستہ ایسا ہو گیا تو اس کے نتائج پاکستان کے حق میں بہت خوفناک ہوں گے!

پنجاب کے اِس روایتی سکوت و سکون کے پس منظر میں وہ دو واقعات بہت نمایاں ہو کر سامنے آئے ہیں جو گذشتہ دو تین ماہ کے دوران رونما ہوئے اور جن سے ملک و ملّت مستقبل کے ضمن میں نئے شکوک و شبہات نے جنم لیا ہے:

ایک پنجاب کے موجودہ برسرِ اقتدار لوگوں کی باہمی رسّہ کشی ہی نہیں باضابطہ چھینا جھپٹی جس نے چالیس سال قبل کی اس دولتانہ ممدوٹ کشمکش کی یاد تازہ کر دی ہے جس کے نتیجے میں پاکستانی سیاست کی گاڑی پہلی بار دستوری و قانونی پٹڑی سے اُتری تھی اور حکومت پر بیوروکریسی کے فیصلہ کُن غلبے کی راہ ہموار ہوئی تھی ——— اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پنجاب کے چوہدریوں، کو تا حال ملک و ملّت کو درپیش عظیم تر مسائل کا کوئی شعور و ادراک حاصل نہیں ہوا اور اُن کی عظیم اکثریت کی سوچ زیادہ تر خالص ذاتی اور اس سے آگے صرف خاندانی، گروہی اور طبقاتی مفادات اور مصلحتوں کے گرد گھومتی ہے ——— اور ظاہر ہے کہ ملک کے سب سے بڑے صوبے کے حکمران طبقے (RULING ELITE) کی یہ کیفیت ملکی استحکام کے نقطۂ نظر سے ہرگز قابلِ اطمینان نہیں ہے!

دوسرا اور فوری اعتبار سے کہیں اہم تر معاملہ اُن شیعہ سُنّی فسادات کا ہے جو محرّم الحرام اور صفر المظفر کے دو مہینوں کے دوران میں لاہور سمیت پنجاب کے متعدد شہروں اور قصبوں حتّٰی کہ دیہات تک میں ہوئے اور جن سے بلاشبہ پاکستان کے عدم استحکام کی داستان میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ اس لیے کہ اگرچہ محرّم کے جلوسوں کے ضمن میں معمولی نوعیّت کی تلخیاں تو ہمیشہ کا معمول رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی ماہ محرّم قریب آتا ہے۔ امن کمیٹیاں بھی بننی شروع ہو جاتی ہیں اور وحدت و اتحاد کے درس بھی نشر ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس سال پورے پنجاب میں بالعموم اور صوبائی دارالحکومت لاہور میں بالخصوص جو کچھ ہوا اُسے کسی فوری یا وقتی اشتعال کا مظہر قرار دینا یا حد درجہ

سادہ لوحی کا نتیجہ ہو سکتا ہے یا خالص مصلحت پرستانہ خود فریبی کا شاخسانہ۔ اس لیے کہ یہ فسادات بدیہی طور پر ایک گہری سازش کا نتیجہ تھے اور بظاہر احوال تو یہی نظر آتا ہے وہ سازش بھی کلیتہً 'ساختہ پاکستان' نہیں تھی بلکہ باہر سے درآمد شدہ تھی۔ واللہ اعلم!

بہرحال اسباب وعلل اور نتائج وعواقب کی تفصیلی بحث سے قطع نظر، یہ امر بالکل واضح ہے کہ ماضیٔ قریب میں اوّلاً کراچی، پھر کوئٹہ اور گذشتہ دو ماہ کے دوران پاکستان کے سب سے بڑے صوبے کو وسیع ترین پیمانے پر لپیٹ میں لینے والی اس فرقہ وارانہ کشیدگی سے پاکستان کے عدم استحکام میں ایک بالکل نئی جہت (DIMENSION) کا اضافہ ہو گیا ہے العیاذ باللہ

بلوچستان

پاکستان کی چالیس سالہ تاریخ کے دوران بلوچستان میں متعدد بار سیاسی بے چینی پیدا ہوئی۔ اور کم از کم دو مرتبہ وہاں بغاوت کی سی صورت بھی پیدا ہوئی اور قبائلی شورش کو دبانے کے لیے قوّت کا استعمال کرنا پڑا۔ اور نہ صرف فوجی کارروائی بلکہ بعض مواقع پر بمباری تک کی نوبت آئی ——— لیکن اِدھر چند سال سے بلوچستان میں بھی خاموشی تھی، اور ماسوائے اس کے کہ اُس کی دو اہم سیاسی شخصیتیں یعنی سردار خیر بخش مرّی اور سردار عطاء اللہ مینگل خود اختیار کردہ جلاوطنی کی زندگی گذار رہے ہیں اور کبھی کبھی یہ خبریں سننے میں آجاتی ہیں کہ افغانستان میں کئی ہزار تربیّت یافتہ بلوچ گوریلے پاکستان کی طرف مارچ کرنے کے لیے تیار کھڑے ہیں، اس عرصے کے دوران اندرونِ بلوچستان نہ کوئی سیاسی ہلچل پیدا ہوئی نہ کوئی قبائلی یا عوامی شورش! ——— اور شاید یہ بھی پنجاب ہی کے مانند کسی نمایاں سیاسی حرکت کے فقدان کا نتیجہ تھا کہ بلوچستان میں بھی کچھ عرصہ قبل ملک وملّت کے دشمنوں نے مذہبی فساد یعنی شیعہ سُنّی تصادم کا مکروہ ترین راستہ اختیار کیا تھا جس کے نتیجے میں کوئٹہ کی سرزمین انسانی خون سے لالہ رنگ ہو گئی تھی۔

لیکن حال ہی میں کوئٹہ میں دو نسلی قومیتوں (ETHNIC GROUPS) یعنی پٹھانوں اور بلوچوں کے مابین جس خونریز تصادم کی صورت پیدا ہوئی جس کے باعث طویل عرصہ تک کرفیو نافذ رہا اُس نے بھی اسلام کے نام پر بننے والی دولت خداداد پاکستان کے مستقبل کے بارے میں شدید اندیشے پیدا کر دیئے ہیں اور گویا خطرے کی گھنٹی بجادی ہے کہ پاکستان کی اصل اساس اور اُس کے قیام کی واحد وجہ جواز یعنی 'اسلام' کے جانب کوئی حقیقی اور واقعی پیشقدمی نہ ہونے کے باعث ع" خانۂ خالی را دیو می گیرد" کے مصداق نسلی و لسانی اور صوبائی و علاقائی عصبیتوں کے جو بیج بوئے گئے تھے اب اُن کی فصل پک کر تیار ہو گئی ہے۔ اور اگر اس صورت حال میں کوئی فوری اور انقلابی قسم کی تبدیلی نہ آئی اور اسلام کے جانب فیصلہ کن پیشقدمی نہ ہوئی تو کیا عجب کہ بفحوائے الفاظ قرآنی: "وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ" (سورۂ شوریٰ آیت ۱۷ ترجمہ: "اور تمہیں کیا معلوم، شاید کہ وہ معیّن گھڑی قریب ہی آچکی ہو") اسلام سے روگردانی اور اللہ سے کیے ہوئے وعدوں کی خلاف ورزی کی آخری سزا کا وقت آن ہی پہنچا ہو! فاعتبروا یا اولی الابصار!

سندھ

رہا صوبۂ سندھ تو اُس کا معاملہ راقم کے نزدیک دوسرے تمام صوبوں سے علیحدہ اور منفرد نوعیت کا حامل بھی ہے ——— اور اس کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ نازک اور پیچیدہ بھی ہے اور پاکستان کے مستقبل کے اعتبار سے سب سے بڑھ کر اہم اور فیصلہ کن بھی! ——— چنانچہ راقم کے اندازے کے مطابق آئندہ چند سال کے دوران میں نہ صرف یہ کہ پاکستان کی قسمت اور اس کے ضمن میں "TO BE OR NOT TO BE!" کا فیصلہ سرزمین سندھ میں ہوگا بلکہ خود سندھ کی سعادت و شقاوت کا آخری فیصلہ بھی ہو جائے گا کہ آیا برّعظیم پاک و ہند کا یہ اوّلین 'باب الاسلام' جو پہلی صدی ہجری کے اواخر میں صنم خانۂ ہند میں توحید ربّانی اور حریّت و اخوّت و مساواتِ انسانی

کے انقلاب آفرین پیغام کا 'مدخل' (یعنی داخل ہونے کی جگہ) بنا تھا، پندھرویں صدی ہجری کے آغاز میں اسلام کا 'مخرج' (نکلنے کی جگہ یعنی 'EXIT') بلکہ 'مدفن' بنتا ہے اور اس طرح چودہ سو سال بعد راجہ داہر کی صُلبی و معنوی اولاد ابوالقاسم محمّد رسولُ اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی رُوحانی ذرّیت اور محمّد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کا نام ادب و احترام اور فخر و امتنان کے ساتھ لینے والوں سے بھرپور انتقام لینے میں کامیاب ہو جاتی ہے یا یہ قطعۂ ارضی جس کی آغوش میں نہ صرف یہ کہ بہت سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ محوِ استراحت ہیں بلکہ عصرِ حاضر کے عظیم محقّق و سکالر ڈاکٹر حمید اللہ بالقابہ کی تحقیق کے مطابق جسے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی قدمبوسی کا شرف حاصل ہوا تھا، اوّلاً پاکستان، پھر برّعظیم پاک و ہند اور بالآخر پورے عالم انسانی میں اِسلام کی نشأۃ ثانیہ اور غلبۂ دینِ حق کے نقطۂ آغاز کی صورت اختیار کرتا ہے! بفحوائے الفاظ قرآنی: "فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُونَ بِأَيِّكُمُ الْمَفْتُونُ" (سورۂ قلم آیت ۵، ۶ ترجمہ: "عنقریب تم بھی دیکھ لو گے اور یہ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے کون بھٹک گیا تھا") اور بقول اقبال ؎

دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا!

اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ اِس وقت سندھ بحیثیّت مجموعی نہایت مایوس کُن منظر پیش کر رہا ہے۔ چنانچہ اندرونِ سندھ کی حد تک میرے وہ الفاظ جو میں نے چار سال قبل ضیاء الحق صاحب کے نام خط میں تحریر کیے تھے کہ: "میرے اندازے میں سندھ میں 'سندھو دیش' کے لیے میدان پورے طور پر بالکل اُسی طرح تیار ہو چکا ہے جس طرح مشرقی پاکستان میں 'بنگلہ دیش' کے لیے ہوا تھا!" جنہیں اُس وقت مخالفوں نے خللِ دماغی کا نتیجہ قرار دیا تھا اور دوستوں نے شدّتِ احساس کا مظہر، آج ایک نوشتۂ دیوار کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ اس لیے کہ اِن چار سالوں کے دَوران انگریزی زبان کے محاورے کے مطابق بہت سا پانی دریائے سندھ میں بہہ چکا ہے' اور سندھی نیشنلزم

کا ننھا منا پودا ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر گیا ہے! ——— اور بنگلہ نیشنلزم کے مقابلے میں اس سندھی نیشنلزم کا زیادہ تکلیف دہ اور اذیت بخش پہلو یہ ہے کہ چونکہ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے زمینی اعتبار سے منقطع بلکہ منفصل تھا اور اس کی علیحدگی نسبتاً آسان تھی۔ لہٰذا وہاں صرف 'حقوق' کا نعرہ کافی تھا اور دین و مذہب کی جڑوں پر تیشہ چلانے کی زیادہ ضرورت نہ تھی لہٰذا وہاں کی علیحدگی کی تحریک میں الحاد و ارتداد کا اثر و نفوذ اتنا نہ تھا جتنا موجودہ سندھی نیشنلسٹ تحریک میں ہے۔ اور جی ایم سید اور اُن کے حواریوں کی ذہانت کو داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے ابتداء ہی میں اندازہ کر لیا تھا کہ سندھ میں محض حقوق کا نعرہ مطلب براری کے لیے کافی نہ ہوگا اور پاکستان کو توڑنے اور سندھ کو "آزاد" کرانے کے لیے دین و مذہب کی جڑ کاٹنی ضروری ہے ——— اور آج اُن کی رُبع صدی سے زیادہ کی محنت و کوشش کا یہ نتیجہ نگاہوں کے سامنے ہے کہ قدیم سندھیوں کی نوجوان نسل کا بہت بڑا حصّہ نہ صرف یہ کہ مذہب سے برگشتہ ہو کر الحاد و مادیّت کی گود میں چلا گیا ہے بلکہ سندھی نیشنلزم اور مارکس کے ڈایالیکٹیکل میٹریلزم (DIALECTICAL MATERIALISM) کا علمبردار بن کر میدان عمل میں آگیا ہے! اور نوبت بایں جا رسید کہ اب اندرونِ سندھ نوجوانوں کی محفلوں اور مجلسوں میں پاکستان یا اسلام کا نام لینا بھی "لانا ہے جوتے شیر کا!" کا مصداق بن چکا ہے! چنانچہ ۹ نومبر ۸۶ء کے اخبارات میں آنسہ بے نظیر بھٹو کے انٹرویو پر جو شہ سُرخی لگی ہے' یعنی "احساسِ محرومی کی وجہ سے سندھ علیحدگی پسندوں کے ہاتھوں کھلونا بن گیا ہے!" اور پھر متن میں جو الفاظ نقل ہوئے ہیں یعنی: "سندھ کی صورتِ حال انتہائی سنگین ہے!" اور اب جو بھی فیڈریشن کی بات کرتا ہے اسے پنجابی ایجنٹ کہا جاتا ہے!" اُن سے سندھ کی صورتِ حال کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے (واضح رہے کہ مس بھٹو خود سیکولر سیاست کی علمبردار ہیں لہٰذا اُن کی ساری سوچ 'احساسِ محرومی' اور 'فیڈریشن' ہی کے گرد گھومتی ہے اور مذہب سے بُعد اور دین سے انحراف کے ضمن میں کسی فکر یا تشویش کی اُن سے توقع نہیں کی جا سکتی!)

اندرونِ سندھ کی اس کیفیت کا چونکہ راقم الحروف کو کئی سال سے پوری شدّت

کے ساتھ اِدراک وشعور حاصل تھا لہٰذا ع" رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج!" کے مصداق اس کا صدمہ راقم کے وجود کی رگ وپے میں سرایت کیے ہونے کے باوجود شعور کی سطح پر نمایاں نہ رہا تھا ــــــــ کہ "ع دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز۔ پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا!" کے مصداق راقم کے قلب وذہن اور احساس وشعور پر ایک بم گرنے کی سی کیفیت پیدا ہوئی کراچی اور حیدر آباد میں واقع ہونے والے پٹھان مہاجر تصادم سے جس میں وحشت وبربریت اور سفّاکی وسنگدلی کی ایسی ایسی مثالیں سامنے آئیں کہ نہ صرف پندرہ سال قبل کے مشرقی پاکستان کے زخم ہرے ہو گئے بلکہ ۱۹۴۷ء کی یادیں تازہ ہو گئیں! چنانچہ راقم کا واقعی احساس یہ ہے کہ بالکل ایسے جیسے سقوطِ مشرقی پاکستان کے حادثۂ فاجعہ کے بعد آنجہانی اِندرا گاندھی نے کہا تھا کہ: "ہم نے دو قومی نظریے کو خلیج بنگال میں غرق کر دیا ہے!" اسی طرح اگر پاکستان کا کوئی دشمن اور بدخواہ اُن واقعات کو جو عروس البلاد کراچی میں اکتوبر ۸۶ء کے آخری اور نومبر کے ابتدائی ایّام میں پیش آئے 'نظریۂ پاکستان' کے کفن کی 'آخری میخ' سے تعبیر کرے تو 'خاکم بدہن' ع" آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں!" کے مصداق اُسے اِس کا حق حاصل ہو گا۔ اس لیے کہ اِس سے قطع نظر کہ یہاں بھی تصادم ایک نسلی اور ایک لِسانی قومیّت کے مابین ہوا اور نسلی اور لِسانی عصبیتیں اصلاً وحدتِ ملّی کے منافی اور نظریۂ پاکستان کی ضد ہیں، اس معاملے کا انتہائی اذیّت بخش اور تکلیف دہ اور حد درجہ مایوس کُن پہلو جس کی بنا پر اسے 'نظریۂ پاکستان' کے کفن کی آخری میخ قرار دیا جا سکتا ہے یہ ہے کہ یہاں وہ لوگ ایک 'لسانی قومیّت' کی شکل میں سامنے آتے' یا لائے گئے' جو ع" ہے ترکِ وطن سنّتِ محبوبِ الٰہی!" پر عمل پیرا ہو کر محض اسلام کے نام پر ہندوستان کے کونے کونے سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ اور جنہوں نے رنگ ونسل، شکل وصورت، وضع وقطع اور تہذیب وثقافت کے جملہ امتیازات کو نظر انداز کر کے اُس ملک کا رُخ کیا تھا جو اسلام کے نام پر وجود میں آ رہا تھا! اور اُن علاقوں کو خیر باد کہہ دیا تھا جن میں وہ پُشت ہا پُشت سے آباد تھے، جہاں اُن کے جدّی وپشتی مکان اور آباؤ اجداد کی قبریں تھیں اور جہاں کی گلی کوچوں سے اُن کے بچپن کی یادیں وابستہ تھیں! ــــــــ

غور کا مقام ہے کہ اگر یہ لوگ بھی قیامِ پاکستان کے چالیس سال بعد حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر یا کسی ردِّ عمل کا شکار ہو کر یہ مطالبہ کرنے لگیں کہ اُن کے جداگانہ تشخص کو تسلیم کر کے انہیں پاکستان کی پانچویں قومیّت کا درجہ دے دیا جائے تو کیا یہ مریض کی آخری ہچکی کے مترادف نہیں ہے؟ اور کیا نظریہ پاکستان، کی نفی کی کوئی اس سے بھی زیادہ افسوسناک اور مایوس کُن صورت ممکن ہے! ——— بقول غالبؔ ؎

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے! کیا خوب! قیامت کا بھی ہوگا کوئی دن اور!

الغرض! پاکستان کے چاروں صوبوں کے حالات اس وقت سخت ناگفتہ بہ ہیں اور بظاہر احوال سے "کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ کوئی امیّد بر نہیں آتی!" کے مصداق بچاؤ کی کوئی صورت اور اُمیّد کی کوئی کرن کسی جانب سے نظر نہیں آتی اور جسے کبھی 'ملّتِ اسلامیہ پاکستان' کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا آج ع "یہی ہے مرنے والی امتّوں کا عالمِ پیری!" کی تصویر نظر آ رہی ہے۔ اس تناظر میں کشمیر اور راجستھان میں بھارتی افواج کی نقل و حرکت اُن مردار خور پرندوں کا نقشہ پیش کر رہی ہے جو کسی قریبُ المرگ حیوان یا انسان کے آس پاس اُس کی موت کے انتظار میں منڈلانا شروع کر دیتے ہیں!

لیکن ——— بفحوائے الفاظِ قرآنی: "لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ" (سورۂ زمر آیت ۵۳ ترجمہ "اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو!") اور "وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ" (سورۂ حجر آیت ۵۶ ترجمہ: "اور اپنے ربّ کی رحمت سے سوائے گمراہ لوگوں کے اور کون مایوس ہو سکتا ہے!" اور "وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ" (سورۂ یوسف آیت ۸۷ ترجمہ "اللہ کے لُطف و کرم سے نا امیّد نہ ہو اس لیے کہ اللہ کے لُطف و کرم کے سوائے کافروں کے کوئی اور نا امیّد نہیں ہوتا!") ——— اور بقول اقبال ؎

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے امیّدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں!

ہمیں یہی ہدایت ہوئی ہے کہ مایوس اور نا امیّد نہ ہوں۔ اور حالات خواہ بظاہر کتنے

ہی نامساعد و ناموافق نظر آئیں اور خواہ مایوسی کے اندھیارے ہر سُو چھا گئے ہوں اور امیّد کی کوئی کرن کسی جانب دکھائی نہ دے رہی ہو اور بچ نکلنے کی کوئی راہ کسی طرف نظر نہ آرہی ہو، ہمیں حکم یہی ہے کہ مایوس اور بددل ہوکر سعی وجہد سے کنارہ کش نہ ہوں بلکہ اللہ کے فضل وکرم کی امیّد ——— اور اُس کی تائید و توفیق کے بھروسے پر زندگی کے آخری سانس تک اللہ کے کلمے کی سربلندی اور اُس کے دین کی اقامت کے لیے تن من دھن لگاتے چلے جائیں خواہ یہ انگریزی محاورے کے مطابق "HOPING AGAINST HOPE" ——— ہی قرار پائے۔ گویا بقول علاّمہ اقبال مرحوم ؎

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں مجھے ہے حکمِ اذاں' لاالٰہ الّا اللہ !

تاکہ اگر ان مساعی کا کوئی ظاہری نتیجہ برآمد نہ ہو تب بھی کم از کم "معذِرةً اِلٰی رَبِّکُمْ" کی صورت تو بن ہی جائے ——— اور کیا عجب کہ کوئی نتیجہ بھی برآمد ہو ہی جائے اور "وَلَعَلَّھُمْ یَتَّقُوْنَ" کی کوئی صورت بھی بن ہی جائے! (سورۃ اعراف آیت ۱۶۴ ترجمہ: "اور یاد کرو جب اُن کی قوم کے ایک گروہ نے کہا تھا کہ ایسی قوم کو وعظ و نصیحت (میں وقت و قوّت ضائع) کیوں کر رہے ہو جسے اللہ تعالےٰ (قطعی طور پر) ہلاک کرکے رہے گا یا کوئی شدید عذاب دے کر رہے گا؟" تو انہوں نے جواب دیا تھا "تاکہ ہم ربّ کے حضور میں عذر تو پیش کرسکیں! ——— اور کیا عجب کہ یہ لوگ تقویٰ کی روش اختیار کرہی لیں!")

اور اگرچہ ان سطور کے راقم کو اس سے ہرگز انکار نہیں ہے کہ ارضِ پاکستان سے اُس کی دلچسپی دنیوی اور مادّی بنیاد پر بھی ہے' اس لیے کہ گو اِس ملک کے پورے طول و عرض میں صرف ایک مکان کے سوا اس کی نہ کوئی زمین ہے نہ جائداد' اور نہ کوئی سرمایہ ہے نہ کاروبار' تاہم اس کے اہل وعیال بھی یہیں ہیں اور اعزّہ اقارب بھی ——— لیکن اس ارضِ پاک سے اُس کی اصل دلچسپی اس اعتبار سے ہے کہ یہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا گہوارہ اور دینِ حق کی عالمی سربلندی کا نقطۂ آغاز بنے بقول جناب نعیم صدیقی ؎ "اے آندھیو سنبھل کے چلو اس دیار میں ۔ امیّد کے چراغ جلاتے ہوئے ہیں ہم !" اور خدا گواہ ہے کہ تیرہ چودہ برس

کی عمر سے جب اُس نے 'نیم شعوری' دَور میں تحریک پاکستان میں حصّہ لیا تھا، آج چوّن برس کی عمر تک اُس کی زندگی کے چالیس سالوں کے دوران بحمدللّٰہ اس کا سینہ اُسی "آرزو" سے آباد رہا ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ ؎

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں　　　　اور ہو جائے تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام!

اور آج بھی اگرچہ خارجی حالات "HOPING AGAINST HOPE" کا نقشہ پیش کر رہے ہیں اللہ کا شکر ہے کہ اس کے نہاں خانۂ قلب کی کیفیت یہی ہے کہ ؎

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار　　　　ہر زماں پیش نظر لَا یُخْلِفُ الْمِیعَادَ دار!

لہٰذا ـــــــ پاکستان کے 'عدم استحکام' کی تکرار اور پاکستان کے موجودہ حالات کی بھیانک تصویر کشی کا مقصد نہ سنسنی خیزی ہے نہ یاس و نومیدی کی تخم ریزی' بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ ملک و وطن اور دین و مذہب کے مخلصوں اور بہی خواہوں کی غیرت اور حمیّت کو للکارا جائے اور انہیں ع : "معمار حرم! باز بہ تعمیرِ حرم خیز!" کے انداز میں ازسرِ نو کمر ہمّت کس کر ملک و ملّت کی تعمیر نو کی جدّوجہد پر آمادہ کیا جائے ـــــــ اور اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ صورت حال کا بے لاگ تجزیہ کیا جائے، حقائق کا ہمّت کے ساتھ مواجہہ کیا جائے اور پھر مرض کی ظاہری علامات اور ثانوی پیچیدگیوں سے نبرد آزما ہونے اور مریض کی فوری تکالیف اور شکایات کو رفع کرنے کے ساتھ ساتھ اصل توجّہ کو بنیادی خرابی کی تشخیص اور اصل مرض کے ازالے پر مرکوز کر دیا جائے ۔ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ!

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپکی دینی معلومات میں اضافہ اور تبلیغ کے لئے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقہ کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

الہدیٰ (نشست ۲)

ٹیلی ویژن پر نشر شدہ دروس کا سلسلہ (درس ۱۱)

مباحث عمل صالح

بندۂ مومن کی شخصیت کے خدوخال

(سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی روشنی میں)

ڈاکٹر اسرار احمد

(۲)

السلام علیکم ــ نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم ــ امّا بعد
فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ــ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ه
وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا
وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ه وَالَّذِیْنَ
یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا ه وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ
رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ه
اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ه وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ
یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَكَانَ بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ه
صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ

"اور رحمان کے محبوب بندے تو وہ ہیں جو زمین پر تواضع کے ساتھ چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے الجھنا چاہتے ہیں تو وہ سلام کہہ کر ان سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔

اور جو راتیں بسر کرتے ہیں اپنے ربّ کے حضور میں سجدہ کرتے ہوئے اور دست بستہ کھڑے رہ کر۔ اور جو یہ کہتے ہیں کہ اے ربّ ہمارے، ہم سے جہنّم کے عذاب کو پھیر دے۔ یقیناً اس کا عذاب چمٹ جانے والی چیز ہے۔ یقیناً وہ (جہنّم) بہت ہی بُری جگہ ہے مستقل جائے قرار ہونے کے اعتبار سے بھی اور عارضی قیام گاہ ہونے کے اعتبار سے بھی۔ اور وہ جو جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی سے کام لیتے ہیں نہ بُخل سے۔ اور ہے (ان کے لیے) اس کے درمیان ایک سیدھا راستہ، معتدل راستہ۔"

محترم ناظرین و معزز سامعین! ابھی میں نے سورہ فرقان کے آخری رکوع کی پانچ آیات (از نمبر ۶۳ تا ۷۰) تلاوت کیں اور ان کا ایک رواں ترجمہ بھی آپ کے سامنے رکھا۔ ان آیات میں اللہ تعالےٰ اپنے ان بندوں کے اوصاف بیان فرما رہا ہے جو اُسے بہت ہی پسند اور محبُوب ہیں۔ چنانچہ گفتگو کی جو ابتدا ہوئی ہے وہ عِبَادُ الرَّحمٰن کے الفاظ سے ہوئی ہے۔ اللہ تعالےٰ کے ناموں میں سے 'الرّحمٰن' نہایت پیارا نام ہے۔ اس لیے بھی کہ یہ رحمت سے مشتق ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ بندوں کو جس چیز کی زیادہ احتیاج ہے، وہ اللہ تعالےٰ کی رحمت ہی ہے۔ اور اس لیے بھی کہ اگرچہ رحمت سے اللہ تعالےٰ کا ایک نام اور بھی بنتا ہے اور وہ ہے الرحیم ــــ لیکن 'الرحیم' میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی شان ایک مستقل اور دائم حقیقت کی حیثیت سے سامنے آتی ہے۔ جبکہ 'الرحمٰن' میں اللہ تعالیٰ کی جو شان سامنے آتی ہے وہ ایک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے مانند ہے، جس میں جوش و خروش ہو، جس میں ہیجان ہو۔ یہ لفظ ہیجان بھی فعلان کے وزن پر عربی ہی کا لفظ ہے۔ اسی وزن پر عربی زبان میں متعدد الفاظ آتے ہیں۔ مثلاً عطشان، انتہائی پیاسا جس کی پیاس سے جان نکلی جا رہی ہو۔ جُمعان، نہایت بھُوکا جو بھُوک سے مر رہا ہو ــــ غضبان، نہایت غضبناک ــــ طغیان، حد سے بالکل نکل جانے والا ــــ چنانچہ جب دریاؤں کا پانی سیلاب کی وجہ سے حدود سے تجاوز کرتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ طغیانی آگئی ــــ تو اللہ تعالیٰ کا یہ نام نامی، یہ اسمِ گرامی 'الرحمٰن' بہت ہی پیارا ہے۔ اس میں اللہ تعالےٰ کی رحمت ایک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح سامنے آتی ہے۔

پھر "عباد الرحمٰن" کے فرمانے میں بھی ایک محبت کا انداز، شفقت و عنایت کا انداز ہے یعنی اللہ کے محبوب بندے، اللہ کے پسندیدہ بندے وہ ہیں جن میں وہ اوصاف پائے جاتے ہیں جن کا ذکر آگے آرہا ہے۔

ان اوصاف میں سے پہلا وصف آیا: اَلَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا "وہ لوگ جو زمین پر چلتے ہیں آہستگی سے نرمی سے۔ ان کی چال سے تواضع نمایاں ہوتی ہے"۔ یہ بات جان لیجئے کہ جیسے انگریزی میں کہتے ہیں کہ Face is the Index of the Mind آپ کسی انسان کے چہرے کو دیکھ کر اس کے باطنی احساسات و جذبات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح واقعہ یہ ہے کہ انسان کی چال سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں غرور ہے، یہ کسی فخر میں مبتلا ہے، یہ گھمنڈی ہے۔ اکڑ کر چلے گا، اس کی چال بتائے گی کہ اس کی ذہنی کیفیت کیا ہے! یا پھر اس کی چال سے یہ ظاہر ہوگا کہ اس میں عجز ہے، تواضع ہے، فروتنی ہے، انکساری اور خاکساری ہے۔ تو یہ ہے پہلا وصف۔ اس لیئے کہ بندہ اگر اس حقیقت کو پہچان لے کہ میں بندہ ہوں، آقا نہیں ہوں۔ آقا تو صرف ایک ہے اور وہ اللہ ہے۔ باقی بڑے سے بڑا انسان بھی بندہ ہے عبدیت ہی درحقیقت ہمارا طرۂ امتیاز ہے۔ چنانچہ آپ نوٹ کریں گے کہ قرآن مجید میں جہاں بھی اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خصوصی عنایت کے ساتھ خطاب فرمایا ہے یا آپؐ کا ذکر فرمایا ہے۔ جہاں خصوصی محبت و شفقت اور التفات کا اظہار ہوتا ہے، وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عبدیت کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ جیسے: سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی۔ اور جیسے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ۔ اور جیسے: تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۝ دیکھئے کس قدر لطیف ربط ہمارے سامنے آیا۔ یہ پہلی آیت ہے اس سورہ مبارکہ کی جس کے آخری رکوع کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس سورہ مبارکہ کے آخری رکوع کا تَبٰرَكَ الَّذِیْ کے الفاظ سے آغاز ہوتا ہے۔ آغاز میں فرمایا: تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ "بڑی بابرکت بلند مرتبت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے (صلی اللہ علیہ وسلم) پر الفرقان یعنی قرآن مجید نازل فرمایا۔"

تو یہ عبدیت درحقیقت معراجِ انسانیت ہے لہٰذا یہاں عباد الرحمٰن، فرمانے میں بڑی شفقت، محبت، عنایت اور التفات کے پہلو مضمر ہیں۔ مراد ہے وہ لوگ جو واقعی اللہ کے بندے ہیں اُن کی چال ڈھال سے نمایاں ہوتا ہے کہ یہ اپنے آپ کو بندہ ہی سمجھتے ہیں، آقا نہیں سمجھتے۔ یہ اپنے آپ کو مملوک سمجھتے ہیں اور اپنے مالک اپنے آقا کو پہچانتے ہیں۔ چنانچہ ان کی چال گواہی دیتی ہے کہ فخر و غرور کے بجائے ان میں عجز و فروتنی کے احساسات و جذبات جاگزیں ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ ہمارے اس منتخب نصاب کا جو تیسرا درس سورہ لقمان کے دوسرے رکوع پر مشتمل تھا، اس کے بھی آخر میں اسی وصف پر زور دیا گیا تھا: وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ۝ حضرت لقمانؑ اپنے بچے کو نصیحت فرماتے ہیں کہ اے میرے بچے! اپنے گال لوگوں کے لیے پھلا کر نہ رکھ اور زمین پر اکڑ کر مت چل۔ بے شک اللہ کو بالکل پسند نہیں ہیں شیخی خورے اور اترانے اور غرور و فخر سے کام لینے والے۔" تو یہاں نقطۂ آغاز وہ وصف ہے جہاں سورہ لقمان کے دوسرے رکوع کے مضامین کی قریباً انتہا ہوئی تھی۔

اسی آیت میں دوسرا وصف بیان ہوا ہے: وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا ۝ یہ بھی درحقیقت انسان کی شخصیت کی پختگی اور MATURITY کی ایک بہت بڑی علامت ہے۔ بعض لوگ اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر لوگوں سے بیکار سی بحث و تمحیص میں اُلجھ جاتے ہیں۔ حالانکہ اس طرح کی بحث و مباحثہ کا حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ ایک MATURE انسان کا لازمی وصف یہ ہوگا کہ وہ اندازہ کرے کہ اس کا مخاطب اس وقت بات سمجھنے کی مُوڈ (MOOD) میں ہے یا محض بحث و نزاع پر تُلا ہوا ہے اور اگر وہ یہ محسوس کرے کہ یہ شخص اس وقت افہام و تفہیم کی مُوڈ میں نہیں ہے، یہ میری بات کو سنجیدگی سے نہیں سُن رہا۔ یہ ضد اور عناد میں مبتلا ہو چکا ہے اس وقت ہٹ دھرمی اس پر مسلط ہو چکی ہے، یہ خواہ مخواہ مجھ سے اُلجھ رہا ہے بات کو سمجھنا اس کے پیشِ نظر سرے سے ہے ہی نہیں۔ تو بڑی خوبصورتی سے سلام کہہ کر اس سے علیحدہ ہو جائے۔ بعض جوشیلے قسم کے مبلغین ایسے موقع پر تلخی پر اُتر آتے

ہیں، تلخ کلامی اختیار کر لیتے ہیں یا علیحدہ بھی ہو لیتے ہیں تو اس طور سے گویا لٹھ مار کر علیحدہ ہو رہے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پھر دوبارہ گفتگو کا موقع باقی نہیں رہتا۔ اگر آپ خوبصورتی کے ساتھ علیحدگی اختیار کریں تو موقع رہے گا کہ آپ آئندہ کسی مناسب وقت پر جب یہ محسوس کریں کہ یہ شخص سمجھنے سمجھانے کے موڈ میں ہے تو اس کے سامنے آپ دوبارہ اپنی بات رکھنے کی پوزیشن میں ہو سکتے ہیں۔ آپ نے نوٹ فرمایا ہوگا یہ دونوں چیزیں بڑی ہی پختہ اور MATURE شخصیت کے نمایاں اوصاف میں سے ہیں۔ جن سے یہاں گفتگو کا آغاز ہو رہا ہے۔

اس کے بعد فرمایا: وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ۝ اب یہاں ایک فوری تقابل اور ضد SIMULTANEOUS CONTRAST آپ کے سامنے رہے۔ ہمارے سابقہ درس میں نماز کا ذکر آیا اور بار بار آیا: قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۝ اور پھر ان اوصاف کا اختتام ہوا ان الفاظ مبارکہ پر: وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ ابتدا بھی صلوٰۃ کے ذکر سے اور اختتام بھی صلوٰۃ کے ذکر پر۔ پہلے صلوٰۃ میں خشوع کا ذکر ہے جو اس کی باطنی روح ہے اور آخر میں صلوٰۃ کی محافظت، صلوٰۃ کی مداومت کا ذکر ہے۔ لیکن نوٹ کیجئے کہ یہاں رات کی نماز کا ذکر ہے۔ یہ نمازِ تہجد ہے، اس لیے کہ ایک مسلمان میں جو بنیادی اوصاف درکار ہیں کہ جن سے تعمیرِ سیرت کا وہ پروگرام وجود میں آتا ہے جو قرآن مجید دیتا ہے۔ اس کی ابتدا و انتہا ہے اقامت الصلوٰۃ، نماز پنجگانہ جو فرض ہے اس کو قائم کرنا، اس کی پابندی کرنا، اس کے تمام آداب اور جملہ شرائط کے ساتھ اس کی ادائیگی کا اہتمام کرنا۔ لیکن یہاں بات بالکل دوسری ہے۔ یہاں تو اس سطح کی گفتگو ہو رہی ہے کہ جہاں ایک انسان اللہ تعالیٰ کی محبوبیت کا مقام اور درجہ حاصل کرلے۔ یہاں جس نماز کا ذکر ہے، وہ رات کی تنہائی کی نماز ہے: وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ۝ یعنی ان کی راتوں کا نقشہ ان لوگوں کی راتوں کی کیفیت سے بالکل مختلف ہے جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں جو پوری رات پاؤں پھیلا کر سوتے ہیں۔ ان کو اس غفلت کا احساس تک نہ ہوگا چونکہ ان کے دل میں کوئی لگن نہیں ہے۔ ان کے دل میں اللہ کی محبت کا جذبہ نہیں ہے۔ لیکن جن لوگوں کے دلوں میں اللہ

تعالیٰ کی محبت گھر کر چکی ہو ان کو ان کا وہ جذبہ محبت رات کے وقت سونے نہیں دیتا۔ وہ رات کو بار بار اُٹھتے ہیں، اپنے رب کے حضور دست بستہ کھڑے ہوتے ہیں یا اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز رہتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی نماز کی کیفیات کے متعلق ہمیں روایات میں یہ نقشہ ملتا ہے کہ آپؐ راتوں کو بار بار اُٹھتے تھے، چونک چونک کر اُٹھتے تھے اور آپؐ اپنے رب کے سامنے نماز میں دست بستہ کھڑے ہوتے تھے، سجدہ ریز ہوتے تھے۔ درحقیقت جو تکمیلی اوصاف ہیں، اُن میں یہ رات کی نماز، تہجد، قیام اللیل عظیم ترین اہمیت کی حامل ہے — اور جو اساسی و بنیادی اوصاف تھے، اس میں سب سے زیادہ اہم وصف ہے اقامت الصلوٰۃ، پنج وقتہ فرض نماز کی پابندی — ظاہر بات ہے کہ جو لوگ رات کے وقت کی اس نماز کی پابندی کر رہے ہوں، کیسے ممکن ہے کہ فرض نمازوں کا جو نظام ہے اس میں وہ کسی درجہ میں بھی کوتاہی یا غفلت سے کام لیں — !!

اس کے بعد فرمایا کہ اپنے رب کے سامنے اس قیام اللیل کے نتیجہ میں جو دعا ان کے دل سے نکل کر زبان پر آتی ہے وہ یہ ہے کہ "اے رب ہمارے! ہمیں جہنم کی سزا سے بچا، اس کو ہم سے دُور کر دے" اس میں درحقیقت اس طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ جہاں مخلوق کے سامنے ان کی روش تواضع اور فروتنی کی ہوتی ہے، وہاں وہ اپنے رب کے سامنے بھی نہایت عاجزی کا انداز اختیار کرتے ہیں۔ انہیں اپنی نیکی پر کوئی فخر یا غرور نہیں ہوتا۔ وہ کسی زعم یا گھمنڈ میں مبتلا نہیں ہوتے بلکہ ان کو ہمیشہ یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ نہ معلوم ہمارے اعمال اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہو رہے ہیں یا نہیں ہو رہے ہیں! لہٰذا اُن پر ایک لرزہ طاری رہتا ہے۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورہ نُور کے پانچویں رکوع کی آیات میں آچکا ہے کہ وہ لوگ لرزاں و ترساں رہتے ہیں، خائف رہتے ہیں اپنے رب کے عذاب سے — چنانچہ ہم کبار صحابہ کرامؓ کے حالات میں یہ پڑھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ ایک عجیب کیفیت کے عالم میں یہ فرمایا کرتے تھے کہ کاش! میں گھاس کا ایک تنکا ہوتا جو جلا دیا جاتا ہے اور اس سے کوئی حساب کتاب نہیں ہوگا کاش! میں درختوں پر چہچہانے والی ایک چڑیا ہوتا جو چہچہاتی ہے پھر ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس سے کوئی محاسبہ نہیں ہوگا — حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے

میں آتا ہے کہ ویسے آپؐ کا جسم بہت گٹھا ہوا اور بڑا مضبوط تھا لیکن جب آپ رضؓ نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو جسم خشیتِ الٰہی سے نہایت نرم پڑ جاتا تھا۔ ایک مرتبہ آپؐ کے جسم میں ایک تیر پیوستہ ہو گیا جو نکالے نکل نہیں رہا تھا۔ آپ رضؓ نے فرمایا کہ مجھے نماز کی نیت باندھ لینے دو، اس حالت میں تیر نکال لینا۔ یہ ہے وہ کیفیت: وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝ یہ جہنم کا عذاب تو چمٹ جانے والی چیز ہے، یہ عذاب تو جان کو لاگو ہو جانے والا ہے، اس سے انسان کو چھٹکارا نہیں ملے گا۔ آگے جہنم کے بارے میں الفاظ آئے ہیں، "وہ مُستقر بھی بہت بُرا ہے اور مقام بھی۔" عربی زبان میں مستقر کہتے ہیں جائے قرار کو — جہاں انسان کا مستقل ٹھکانا ہو۔ اُردو میں بھی مستقر اسی معنی میں مستعمل ہے — اور مقام کے معنی ہیں قیام کی جگہ۔ جہاں بھی تھوڑی دیر کے لئے انسان رُکتا ہے وہ اس کا مقام ہے — تو ان الفاظ کے ذریعہ سے تاثر یہ دیا جا رہا ہے کہ جہنم اتنی بُری جگہ ہے کہ اگر کسی کی مستقل جائے قرار بن جائے تو اس کی بربادی، رسوائی، ہلاکت کا ذکر ہی کیا ہے! یہ تو اتنی بُری جگہ ہے کہ اس میں اگر تھوڑی دیر کے لیے بھی قیام ہو تو یہ اپنی تمام ہولناکیاں اور سختیاں پورے طور پر ظاہر کر دے گی۔ عام طور پر ہمارا یہ تصور ہے کہ کسی اچھی سے اچھی جگہ پر بھی اگر مستقل رہنا پڑے تو اس میں دلچسپی نہ رہے گی، رعنائی نہ رہے گی۔ انسان اُکتا جائے گا۔ اور بُری سی بُری جگہ بھی انسان اگر تھوڑی دیر کے لیے جائے تو یہ تبدیلی اس کیلئے تفریح کا ذریعہ بن جائے گی۔ لیکن یہاں آپ الفاظ دیکھیں گے: اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝ — اور اس رکوع کے آخر میں آپ دیکھیں گے کہ جنّت کے بارے میں آئے گا: حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝ یہ بھی ایک فوری تقابل کے لیے ہے کہ جنّت اتنی اچھی جگہ ہے کہ انسان اُس میں ہمیشہ کے لیے رہے گا تب بھی اس جنّت کی رعنائیوں، دل آویزیوں، لطافتوں، دلچسپیوں میں اُسے کوئی کمی محسوس نہیں ہوگی انسان اُکتائے گا نہیں اور جہنم اتنی بُری جگہ ہے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اگر کسی کو اس میں داخل کر دیا جائے تو وہ اپنی ساری شدّتیں، اپنی ساری غلظتیں، اپنی ساری کلفتیں آنِ واحد میں ظاہر کر دے گی۔

اِس کے بعد فرمایا" وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو میانہ روی اختیار کرتے ہیں"۔ یہ بھی شخصیت کی پختگی اور بالغ نظری کی علامت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اگر ایک وقت ہاتھ کشادہ ہے تو الّلوں تلّلوں میں انسان پیسہ اُڑا دے۔ اور اگر کسی وقت تنگی ہو گئی ہو تو انسان بالکل بجھ کر رہ جائے۔ اور نہ ایسا ہو کہ جہاں خرچ کرنا لازمی اور ضروری ہو وہاں وہ رُکے، یہ بخیلی ہے۔ ان تین رویّوں کے بجائے ایک بین بین اور معتدل روش اختیار کرنا ایک اعلیٰ و ارفع وصف ہے۔ لہٰذا فرمایا: وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا "وہ لوگ جو جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف سے کام لیتے ہیں" وَلَمْ يَقْتُرُوْا "اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں" بلکہ: وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝ "اُن کا طرزِ عمل ان کا موقف اس کے بین بین ہوتا ہے"۔ یہ بات بھی سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے آخر میں آئی تھی: وَاقْصِدْ فِىْ مَشْيِكَ "اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر"۔ یہاں چال ڈھال میں بھی اعتدال مراد ہے اور خرچ میں بھی — تو وہی وصف ہے جو یہاں ایک دوسرے اسلوب سے بیان ہوا۔

آج کی نشست میں اسی پر اکتفا کیجئے۔ اب اس موضوع پر جو کچھ آج بیان ہوا ہے، اِس کے ضمن میں کوئی سوال ہو یا کوئی وضاحت مطلوب ہو تو میں حاضر ہوں۔

سوال و جواب

سوال: ڈاکٹر صاحب! قیامت میں جہنّم کی سزا کی حقیقت کو جان لینے کے باوجود مسلمان برائیوں کو کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟

جواب: بہت عمدہ سوال ہے۔ اصل میں جہنّم اور جنّت دونوں کا تعلق عالمِ غیب سے ہے۔ اگر یہ ہماری ان ظاہری نگاہوں کے سامنے ہوتیں تو کوئی انسان بھی کوئی بُرا کام نہ کرتا اور تمام لوگ نہایت متقی ہو جاتے۔ لیکن چونکہ یہ عالمِ غیب کی حقیقت ہے جو ہمیں پیغمبروں کے ذریعہ سے معلوم ہوئی ہے تو اصل مسئلہ ان پر یقین کا ہے۔ اگر جنّت اور دوزخ کی حقیقت پر دلی یقین والا ایمان حاصل اور راسخ ہو جائے تو یقیناً انسان بُرائیوں سے اجتناب کرے گا اور بھلائیاں اختیار کرے گا۔ ہمارا اصل مرض یہ ہے کہ اگرچہ عقیدے کے طور پر اپنے والدین سے وراثتاً جو چیزیں ہم تک منتقل ہو گئی

ہیں۔ انہیں ہم ماننے کی حد تک تو مانتے ہیں لیکن اس دور کے جو اثرات ہیں، غلط تعلیم کے جو نتائج ہیں، غلط اور ملحدانہ نظریات کا ذہنوں پر جو شعوری یا غیر شعوری طور پر تسلط ہے، ان وجوہ سے دلی یقین والی جو کیفیت ہے وہ ہمیں میسر نہیں۔ الا ماشاء اللہ۔ علامہ اقبال مرحوم نے اسی لیے کہا ہے ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو دلی یقین والا ایمان عطا فرمائے

سوال: ڈاکٹر صاحب! کیا یہ ممکن ہے کہ ہم طبعی اسباب و علل کی اس دنیا میں رہتے ہوئے دوزخ اور جنت کے تصور کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔

جواب: جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ یہ عالم غیب کے حقائق ہیں لہٰذا ہم اس دنیا کی چیزوں کو جس طور پر دیکھ سکتے اور سمجھ سکتے ہیں، اس طور سے ہم اُس عالم کی باتوں کو نہیں دیکھ اور سمجھ سکتے۔ البتہ انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کی دی ہوئی اطلاعات اور خبروں کی بنیاد پر ایک اجمالی علم اور یقین ہمیں بھی حاصل ہو سکتا ہے اور یہ یقین صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں بتمام و کمال پیدا ہوا، اسی لیے ان کی زندگیوں میں عظیم انقلاب آگیا۔ ویسے قرآن مجید اور احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں عالم آخرۃ کے احوال سے متعلق جو کچھ بھی بیان ہوا ہے وہ محض تصوراتی باتیں نہیں ہیں بلکہ پردۂ غیب میں مستور حقائق ہیں۔ اگر قرآن مجید اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر دلی یقین والا ایمان حاصل ہو جائے تو عالم غیب کے احوال ایک بندۂ مومن کے لیے بھی تصور نہیں بلکہ حقیقت بن جاتے ہیں۔ سورہ قیامہ کے درس کے دوران میں قدرے تفصیل سے بیان کر چکا ہوں کہ جزا و سزا، اُخروی کا تقاضا خود انسان کی فطرت میں مضمر ہے۔ اس پر غلط ماحول، غلط تعلیم و تربیت سے غفلت کے پردے پڑ جاتے ہیں۔ نبی اور رسول تشریف لا کر اللہ تعالیٰ کے کلام اور اپنی تعلیمات سے غفلت کے ان پردوں کو چاک کرتے ہیں اور بدیہیاتِ فطرت کو اجاگر فرما دیتے ہیں۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! اس دور میں لوگ اپنے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے لیے بہت زیادہ خرچ کرتے ہیں۔ اس بارے میں قرآن مجید کی تعلیم کیا ہے؟

جواب : قرآن مجید ضرورت سے زائد خرچ کرنے کو اسراف سے تعبیر کرتا ہے اور ایک بیماری اس سے آگے کی بھی ہے۔ وہ ہے نمائش اور نام ونمود کے لیے خرچ کرنا۔ اس کو قرآن مجید "تبذیر" کہتا ہے۔ اس کا ذکر ہمارے آئندہ کے ایک درس میں آنے والا ہے۔ جہاں فرمایا گیا: اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ط وہ لوگ جو نمائش اور نام ونمود کے لیے الَلّوں تَلَلّوں میں دولت کو اُڑانے والے ہیں وہ شیطان کے بھائی ہیں ۔۔ قرآن مجید ان کی اتنی شدید مذمت کرتا ہے کہ انہیں شیطانوں کا بھائی قرار دیتا ہے۔ اس سے تبذیر کی شناعت اور اس کے بدترین گناہ ہونے کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

حضرات! آج کی اس نشست میں ہم نے چند ایسے اوصاف کا مطالعہ کیا جو رحمان کو جو ہمارا رب، ہمارا پروردگار، ہمارا پالن ہار ہے، نہایت پسند ہیں۔ ہماری دعا اور شعوری کوشش ہونی چاہیئے کہ یہ اوصاف ہمارے اندر پیدا ہوں ۔ ہمیں قرآن مجید کا پڑھنا پڑھانا اور سُننا اور سنانا اِس نیت کے ساتھ کرنا چاہیئے کہ قرآن مجید جن بھلائیوں کی ترغیب دلاتا ہے ہم اپنی امکانی سعی کریں اور وہ بھلائیاں ہمارے اندر پیدا ہوں۔ اللہ تعالےٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

ڈاکٹر اسرار احمد

کی تالیف

استحکامِ پاکستان

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن
فون: ۸۵۲۶۱۱

پاکستان کیوں بنا ۔۔۔۔ کیسے بنا
پاکستان کیوں ٹوٹا ۔۔۔۔ کیسے ٹوٹا
اب ٹوٹا تو ۔۔۔۔۔
پاکستان کی تاریخ کا حقیقت پسندانہ تجزیہ
اندھیروں میں اُمید کی ایک کرن
لفظ لفظ میں ۔۔۔۔ وطن کی محبت
سطر سطر میں ۔۔۔۔ ایمان کی چاشنی
عمل کا پیغام ۔۔۔۔۔

قندِ مکرّر

کَلَّآ اِنَّھَا تَذْکِرَۃٌ

[۱۹۸۲ء میں انجمن خدام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام منعقدہ تربیت گاہ کے موقع پر مولانا امین احسن اصلاحی کا نہایت مؤثر افتتاحی خطاب]

خطبہ مسنونہ کے بعد فرمایا :

بھائیو! میں سب سے پہلے اس حقیقت کا اظہار کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اس اجتماع میں برکت دینے کے لیے نہیں لینے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ میری حاضری کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ میں اپنے مخدوم اور محترم دوست مولانا عبدالغفار حسن صاحب کے درس سے کچھ برکت حاصل کروں۔ "برکت حاصل کرنا" میں نے اس لیے عرض کیا ہے کہ میں اب استفادہ کے قابل تو رہا نہیں صرف برکت ہی حاصل کر سکتا ہوں۔ مولانا سے مجھے صرف محبت ہی نہیں ہے بلکہ بلا شائبہ تکلف عرض کرتا ہوں کہ مجھے ان سے عقیدت بھی ہے۔ درآنحالیکہ عقیدت کے معاملے میں میں بہت فیاض آدمی نہیں ہوں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ مجھے ان سے محبت ہی نہیں بلکہ عقیدت بھی ہے اور میں آپ لوگوں کو بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ آپ کو ان کے درس سے اور ان کی صحبت سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کا موقع ملے گا۔

میری حاضری کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ آپ کی صحبت اور آپ کی معیّت کا تھوڑا بہت ثواب میں بھی حاصل کر لوں۔ اس زمانہ میں ایسے انسانوں کی تو کمی نہیں ہے جو ارسطو کی تعریف کے مطابق "انسان" ہیں اس لیے کہ بہر حال "حیوان ناطق" ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بس حیوانِ ناطق ہی ہیں، قرآن کی تعریف کے مطابق وہ انسان نہیں ہیں اس لیے کہ وہ بصیرت اور بصارت دونوں سے محروم ہیں۔ فی زمانہ ایسے انسان بہت ہی تھوڑے ہیں جو اصل حقیقت کو سمجھنے کے لیے جدوجہد کریں۔ اس کے لیے گھر سے نکلیں، اس کے لیے تکلیفیں اٹھائیں، اس کے لیے ان کے اندر ذوق شوق ہو۔ میں آپ لوگوں کو انہی میں

شمار کرتا ہوں جو ایک نہایت ہی محبوب اور عظیم مقصد کے لیے گھر سے نکلے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اس ارادے میں خیر و برکت عطا فرمائے اور آپ کو زیادہ سے زیادہ مستفید اور مستفیض ہونے کا موقع دے۔

حضرات! میرا ارادہ تو یہی تھا کہ میں شرکت کے ذریعے برکت حاصل کروں۔ لیکن میرے عزیز بھائی شیخ سلطان احمد صاحب اور برادر عزیز ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی مجھے یہ خواہش بھی معلوم ہوئی کہ میں آپ کے سامنے تقریر بھی کروں، تو میں نے ان کی خواہش کی تعمیل ضروری سمجھی، لیکن میں جو کچھ عرض کروں گا اس کی نوعیت ہرگز تقریر کی نہیں ہو گی بلکہ چند نہایت ہی واضح اور بدیہی حقیقتوں کی "تذکیر" ہی کی ہو گی۔ یعنی صرف یاد دہانی۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض حقیقتیں اپنی جگہ انتہائی واضح ہوتی ہیں۔ لیکن شاید اپنی شدت وضاحت ہی کی وجہ سے بہت مجہول ہو جاتی ہیں لہٰذا ان کی وقتاً فوقتاً تذکیر ہوتی رہنی چاہیے۔ میری اپنی زندگی کی رہنمائی میں ان حقائق نے بہت مدد دی ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر آپ کو بھی ان کی یاد دہانی کرا دوں تاکہ آپ حضرات بھی ان سے فائدہ اٹھائیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ خدا ہے اور ضرور ہے اور خدا کے ماننے پر ہر انسان مجبور ہے۔ جو لوگ خدا کا انکار کرتے ہیں وہ ایک بدیہی حقیقت کا انکار کرتے ہیں۔ میں اس معاملہ میں اپنا یہ ذاتی احساس عرض کر دیتا ہوں کہ جب اوّل اوّل مجھے اس حقیقت کا شعور ہوا کہ خدا ہے اور ضرور ہے، نیز یہ کہ انسان اس کا انکار نہیں کر سکتا اور اس سے مفر نہیں ہے تو اس کے ساتھ ہی اس بات کا بھی ادراک ہوا کہ اس "ماننے" سے بہت بھاری ذمہ داریاں انسان پر عائد ہو جاتی ہیں۔ جب کبھی میں ان ذمہ داریوں کے متعلق سوچتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ اس کا بوجھ میری کمر توڑ دے گا۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ کچھ فلسفی ایسے بھی ہیں جو خدا کا انکار کرتے ہیں تو واقعہ یہ ہے کہ مجھے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ان کی چیزوں کا بھی مطالعہ کروں اور صاف طور پر عرض کیے دیتا ہوں کہ بغیر کسی تعصب کے میں نے ان چیزوں کا مطالعہ کرنا چاہا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ میرے اندر یہ چھپی ہوئی خواہش بھی موجود تھی کہ اگر فلسفی یہ ثابت کر دیں کہ خدا نہیں ہے تو میں اس کا خیر مقدم کروں گا اس لیے کہ اس طرح بہت

بڑے بوجھ سے نجات مل جائے گی۔ یہ ایک مخفی راز ہے جو میں آپ پر ظاہر کر رہا ہوں۔ ویسے الحمدللہ مجھ پر الحاد کا کوئی دَور نہیں گزرا ہے۔ لیکن مجھ پر ایک ایسا دَور ضرور گزرا ہے کہ جب میرے اندر یہ خواہش تھی کہ اگر یہ فلسفی حضرات خدا کا انکار ثابت کر دیں اور مجھے مطمئن کر دیں کہ خدا نہیں ہے تو بہرحال ایک اطمینان کا سانس لینے کا موقع ملے گا اور ایک بھاری بوجھ اتر جائے گا۔ اس خواہش کے تحت میں نے متکلمین کی، دہریوں کی، منکرین کی، ڈارون کی، مارکس کی، فرائڈ کی، غرض کہ ان سب لوگوں کی کتابیں بڑی دلچسپی سے پڑھیں اور بغیر کسی تعصب کے پڑھیں، لیکن میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ یہ ساری چیزیں پڑھنے کے بعد مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ ۔۔ یہ سب خرافات ہیں۔ ایک بدیہی حقیقت سے انکار کی خواہش ان سے یہ کام کرا رہی ہے، باقی رہ گیا یہ کہ خدا کے انکار کے لیے ان لوگوں کے پاس واقعی کوئی دلیل ہے تو اس کی سرے سے گنجائش ہی نہیں۔ جو بات یہ پیش کرتے ہیں، اس سے ہزار گنا مضبوط اور بدیہی بات وہ ہے جو قرآن پیش کرتا ہے۔ کہ ایک خدا کو، ایک رب کو، ایک رحمان کو، ایک رحیم کو، ایک علیم کو، ایک خبیر کو، ایک سمیع کو اور ایک بصیر کو مانو۔ اس بات پر عقل بھی گواہی دیتی ہے اور فطرت بھی گواہی دیتی ہے۔ ظاہر بھی گواہی دیتا ہے اور باطن بھی گواہی دیتا ہے۔ آفاق بھی گواہی دیتے ہیں اور انفس بھی گواہی دیتے ہیں۔ غرض کہ ایک ایک چیز گواہی دیتی ہے۔ ہمارے متکلم اور ہمارے فلسفی لوگ خدا کے وجود پر اگر کوئی دلیل قائم کر نہیں پاتے تو جانتے ہو کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ دلیل وہاں کام دیتی ہے جہاں دلیل دعویٰ سے زیادہ واضح ہو لیکن اگر دعویٰ دلیل سے زیادہ واضح ہو تو وہاں دلیل بے کار ہے۔ وہاں دلیل کیا کام کرے گی؟ وہاں ارسطو کی منطق کیا کام کر سکتی ہے؟ وہاں متکلمین کا علم کلام کیا کام کر سکتا ہے؟ سورج کے وجود پر آپ کیا دلیل لا سکتے ہیں؟ چاند کے لیے آپ کیا دلیل لا سکتے ہیں؟ اسی طرح آسمان اور زمین کے وجود پر آپ کیا دلیل لا سکتے ہیں۔ ان چیزوں پر دلیل لانے کی کوشش کرنا درحقیقت حماقت ہے۔ یہ بدیہیات ہیں۔ فطرت کی، آفاق کی، انفس کی، عقل کی سب کی بدیہیات! اس مطالعہ سے مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ جو لوگ خدا کا انکار کرتے

ہیں، وہ محض انکار کرنے کی خواہش کے زیر اثر اندھے اور بہرے ہو گئے ہیں۔ اس لیے کہ وہ جس علت العلل کو، جس محرک اول کو، جس مادہ کو، جس خلیہ کو، اس عظیم کائنات کا سبب قرار دیتے ہیں، اس سے زیادہ اور اس سے لاکھ درجہ آسان اور عقل اور دل کے لیے قابل قبول بات وہ ہے جو قرآن کہتا ہے۔ میں اس کائنات کو کسی محرک اوّل کی حرکت کا نتیجہ مان لوں۔! اس حماقت میں مبتلا ہونے سے زیادہ بہتر یہی ہے کہ میں یہ مان لوں کہ بے شک خدا ہے اور ان ہی صفات کے ساتھ ہے جو قرآن کہتا ہے۔

تو غور کرنے سے معلوم ہوا کہ جو لوگ خدا کا انکار کرتے ہیں، وہ درحقیقت خدا کو ماننے کی جو عظیم ذمہ داریاں انسان کے اُوپر عائد ہوتی ہیں ان سے فرار اختیار کرنا چاہتے ہیں اس کے سوا کوئی اور وجہ نہیں ہے۔ اور اس میں واقعتہً کوئی شک نہیں ہے کہ خدا کو ماننے کے بعد جو عظیم ذمہ داریاں انسان کے اوپر عائد ہوتی ہیں۔ وہ بڑی اہم ہیں۔ بڑی مشکل ہیں۔ بڑی کٹھن ہیں اور بڑی دشوار ہیں۔ اس راہ میں آگے بڑھنا، صرف اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب کہ آدمی سر ہتھیلی پر رکھ کر آگے بڑھے۔ اس میں حضرت یحییٰؑ کی طرح سر کٹوانا پڑتا ہے۔ حضرت مسیحؑ کی طرح سُولی پر چڑھنا پڑتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی طرح آگ میں کود نے کے لیے تیار ہونا پڑتا ہے اور ان تمام مراحل اور مقامات سے گزرنا پڑتا ہے جن مراحل اور مقامات سے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ گزرے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے ہر شخص ہمت نہیں رکھتا اور اسی لیے لوگ گریز اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لہٰذا وہ صاف صاف انکار کر دیتے ہیں کہ ہم ان جھگڑوں ہی میں نہیں پڑتے۔ وہ ان بدیہی حقیقتوں کو "موہوم" کہہ کر گویا ذمہ داریوں سے بچنے کا آسان راستہ نکال لیتے ہیں اور جو لوگ مانتے ہیں جیسے کہ ہم اور آپ ہماری قوم۔ وہ درحقیقت اقرار مع انکار کی پالیسی اختیار کرتے ہیں۔ خدا کو مانتے ہیں لیکن خدا کو ماننے کے جو تقاضے ہیں، ان میں سے کسی تقاضا کو پُورا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ پھر اس کے بعد تقاضوں سے فرار کے لیے طرح طرح کے حیلے اور بہانے اختیار کر لیتے ہیں۔ بڑے فخر اور تعلّی کے ساتھ خدا کا اقرار بھی کرتے ہیں لیکن زندگی کے

کسی مرحلہ میں خدا کے اقرار کے تقاضوں کو پورا کرنے اور خدا کے احکام پر بے چوں و چرا عمل کرنے پر تیار نہیں ہوتے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر دوسرے صریح اور کامل انکار میں مبتلا ہیں تو یقیناً ہم بھی اقرار مع الانکار میں مبتلا ہیں۔ اور ہماری پوری قوم مبتلا ہے۔

اصل چیز یہ ہے کہ خدا کو ماننے تو خدا کو ماننے کے جو مطالبے ہیں، جو تقاضے ہیں جو تضمنات ہیں، جو مضمرات ہیں، جو لوازمات ہیں، جو نتائج ہیں، ان کا مواجہہ کرنے کے لیے تیار رہیئے۔ حقیقت سے گریز کی پالیسی، نہایت بزدلانہ بلکہ منافقانہ ہے۔ اور قرآن کے مطالعہ سے میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں، وہ یہ ہے کہ مآل کے لحاظ سے کفر اور نفاق میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ان کے مابین فرق صرف ظاہر کا فرق ہے نتیجہ کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں کا انجام ایک ہے۔ تو جو لوگ انکار میں مبتلا ہیں وہ تو انکار میں مبتلا ہیں ہی لیکن جو لوگ اقرار والے انکار میں مبتلا ہیں تو واقعہ یہ ہے کہ وہ صریح نفاق میں مبتلا ہیں۔ اب اس صریح نفاق کو اپنے اندر سے نکالنا ایک بڑا معرکہ ہے اور دوسروں کے اندر سے نکالنا اس سے بھی بڑا معرکہ ہے۔ اللہ جن کو ہدایت بخشتا ہے وہ نفاق کو اپنے اندر سے نکال سکتے ہیں اور جن کی ہدایت میں جن کی توفیق میں زیادتی فرماتا ہے وہ دوسروں سے اس کو دور کرنے کی سعی و جہد کرتے ہیں لیکن اس کے لیے بڑی سخت بازی کھیلنی پڑتی ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ حقیقت سے گریز کی پالیسی بالکل غلط ہے حقیقت کا مواجہہ کیجئے۔ اور پوری جرأت کے ساتھ مواجہہ کیجئے اور وہی بندے مبارک بندے ہیں جو یہ کام کریں۔ اللہ تعالیٰ کو بہت ساری بھیڑ مطلوب نہیں، وہ تو مخلص چاہتا ہے۔ اسے تو وہ بندے پسند ہیں جو اس کو اس طرح مانیں جیسے کہ اس کو ماننے کا حق ہے۔ مولویوں کی زبان میں سننا چاہیں تو سنیئے کہ "مانیں ماننا کر" سر دینے کے لیے تیار ہو کر مانیں۔ یوحنا و مسیح کی طرح مانیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کے طریقہ سے مانیں۔ باقی اس کے سوا دوسرا طرزِ عمل مہمل اور خرافات ہے۔ پس حق کو جانیے، حق کو سمجھیے، حق کا علم حاصل کیجئے۔ حق کی معرفت حاصل کیجئے

اور پھر اس حق کو اپنے اوپر قائم کرنے کے لیے اور دوسروں پر قائم کرنے کے لیے اپنے اندر صبر اور عزیمت پیدا کیجیے۔ اسی حق اور اسی صبر پر حقیقت میں صحیح زندگی قائم ہوتی ہے۔ جہاں تک حصول علم و معرفت کا تعلق ہے تو یہ زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ نبیوں کی تعلیم، نبیوں کے صحیفے، اللہ کا شکر ہے، موجود ہیں۔ اللہ کی آخری کتاب قرآن تمام و کمال موجود ہے۔ آخری نبیؐ کی سنت موجود ہے۔ صحابہؓ کی زندگی موجود ہے۔ اگر آپ جاننا چاہیں اور آپ میں جاننے کا شوق اور طلب ہو جس طرح زندگی کی اور طلبیں ہیں، تو یہ کام بہت مشکل نہیں ہے۔ لیکن صبر کا معاملہ بہت مشکل ہے۔ یہ میری زندگی کا تجربہ ہے کہ صبر کا معاملہ واقعی بہت مشکل ہے۔ عزیمت کا معاملہ بہت مشکل ہے۔ میں اس صبر کے متعلق عرض نہیں کر رہا ہوں جس کے کھوکھلے وعظ ہمارے منبروں سے ہوتے رہتے ہیں۔ بلکہ صبرِ حقیقی، عزیمت، استقامت سے میری مراد یہ ہے کہ اللہ کو ماننے اور حق کو تسلیم کرنے کے جو حقیقی تقاضے ہیں ان کو پورا کیا جائے۔ جس حق کو قبول کیا جائے اس کی اپنے قول و عمل سے شہادت بھی دی جائے۔ یہ ہر مومن کا فرض ہے۔ اولین فرض ہے۔

جس شخص میں حق کی طلب نہ ہو، حق کا علم حاصل کرنے کا شوق نہ ہو۔ اُسے آپ ارسطو کی تعریف کے مطابق انسان کہہ دیجیے لیکن میں تو اسے دو ٹانگوں پر چلنے والا جانور ہی سمجھتا ہوں[1]۔ میرے نزدیک وہ حقیقت میں انسان نہیں ہے۔ جس میں حق کی طلب ہو جس کا عظیم داعیہ انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے۔ جس کے اندر یہ داعیہ نہیں ہے وہ مردہ ہے۔ وہ آدمی نہیں ہے بلید ہے اور جانور سے بھی زیادہ بلید ہے[2]۔ لہٰذا اس حق کو قائم کرنا بہت بڑی سعادت ہے۔ پہلے تو اس حق کو اپنے اوپر قائم کیجیے اس لیے کہ جس نے اپنے اوپر اس حق کو قائم نہیں کیا۔ اس کا حق کی شہادت دینے کے لیے اُٹھ کھڑے ہونا فضول کام ہے۔ ایسے کھوکھلے سینوں کی شہادت کچھ کارگر نہیں ہوتی بالکل بے کار ہوتی ہے۔ صرف ان ہی لوگوں کو حق کی شہادت پیش کرنے کا حق ہے جو حق کو پہلے اپنے اوپر قائم کر لیں اور اچھی طرح

---

[1] اُولٰئِكَ كَالْاَنْعَام [2] بَلْ هُمْ اَضَلُّ

جان لیجئے کہ حق کی شہادت دینا بھی فرض ہے۔ حق کو جاننے والے اور علم صحیح رکھنے والے کے لیے میں دین میں، اور قرآن کے تیس پاروں میں، کہیں کوئی گنجائش نہیں پاتا کہ اسے حق کی شہادت دینے سے مفر ہو۔ شہادت حق اس پر واجب ہے۔ لازم ہے، فرض ہے۔ دائیں بائیں، آگے پیچھے، جس حد تک ممکن ہو حق کی شہادت دیجئے۔

لیکن جب شہادت کا مرحلہ آتا ہے تو بڑی مشکلیں پیش آتی ہیں۔ اس کے لیے بسا اوقات ایسے ایسے لوگوں کے کانوں میں حق کی اذان دینی پڑتی ہے۔ جن کے کانوں میں یہ اذان دینا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ بڑے عزیز تعلقات اس کے لیے منقطع ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے عزیز رشتے اس کے لیے کٹ جاتے ہیں۔ بڑے بڑے محبوبوں کی دوستی اس کیلئے قربان کرنی پڑتی ہے اور بسا اوقات سب کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔ آخری چیز جان ہے۔ اس کی بھی نذر گزارنی پڑتی ہے اور صاف سن لیجئے کہ اگر آپ جان کو عزیز رکھتے ہوں تو اس راستہ میں بالکل قدم نہ رکھیے۔ یہ وہ راستہ نہیں جس میں آسانیاں ہوں۔ اس راستہ میں بڑی مشکلات ہیں۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں ان تمام مشکلات کو بیان کروں۔ آپ قرآن کریم کا جو درس حاصل کریں گے ان سے یہ مشکلات معلوم ہو جائیں گی۔

لیکن میرے عزیز دوستو! ایک بات میں آپ کو ضرور بتانا چاہتا ہوں، اور کاش میں اسے اچھی طرح آپ کو سمجھا بھی سکوں۔ وہ بات یہ ہے کہ صبر کہنے کے لیے بہت آسان ہے لیکن کرنے کے لیے بہت مشکل ہے۔ اور پھر یہی وہ چیز ہے جس پر صحیح زندگی استوار ہوتی ہے۔ جہاں تک اہل حق کا تعلق ہے۔ شہادت حق دینے والے لوگوں کا تعلق ہے۔ ان کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ صبر کی بنیاد ایک علمی حقیقت پر ہے۔ ایک حکمت پر ہے جب تک وہ حقیقت و حکمت پوری طرح سے واضح نہ ہو، اس پر علم الیقین اور حق الیقین نہ ہو تو اس وقت تک صبر کرنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ حقیقت و حکمت یہ ہے کہ آپ کے راستہ میں جو کچھ پیش آئے گا وہ اللہ کے ارادہ اور مشیت کے تحت پیش آئے گا۔ اللہ کے ارادہ اور مشیت کے سوا اس دنیا میں اور کوئی ارادہ اور مشیت کارفرما نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر ارادہ میں خیر مضمر ہوتا ہے۔ اگرچہ ہمیں

اس کا خیر معلوم نہ ہو۔ اسی حقیقت کو سمجھنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضرؑ کی تلاش میں نکلنے کا حکم ہوا۔ اس کو خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ جب تک آپ اس حقیقت کو مستحضر نہیں رکھیں گے آپ کی اندرونی زندگی میں اور آپ کی خارجی زندگی میں ایسے ایسے فتنے پیش آئیں گے کہ شیطان آپ کو لوٹا دے گا، آپ کے قدم متزلزل ہو جائیں گے لیکن اگر اس حقیقت پر آپ کا مضبوط یقین ہے کہ جو ہو گا خدا کے ارادہ سے ہو گا اور خدا کا ارادہ ہمیشہ خیر اور حکمت ہی پر مبنی ہوتا ہے تو آپ یقین کریں کہ آپ بڑے سے بڑے مشکل مرحلہ میں بھی ثابت قدم رہیں گے۔ رہی یہ بات کہ خدا کا ہر ارادہ خیر پر مبنی ہے اور خدا کے ارادہ کے سوا کوئی دوسرا ارادہ اس کائنات میں کارفرما نہیں ہے تو یہ ہمارے ایمان کا تقاضا ہے۔ جو اس کو نہیں مانتا وہ مومن نہیں۔ اس کو سمجھنے کی دو شکلیں ہیں یا یہ کہ ہر کام کی حکمت ہمارے اوپر عیاں اور واضح ہو جائے۔ جس کا کوئی امکان نہیں۔ اس لیے کہ ہم خدا تو نہیں بن سکتے۔ ہم بندے ہیں، ہمارا علم محدود ہے۔ یا پھر یہ کہ ہم اس بات پر یقین رکھیں کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے، اس میں خدا کی حکمت مضمر ہوتی ہے۔ کچھ کی حکمت ہماری سمجھ میں آجاتی ہے اور کچھ کی حکمت اپنے محدود علم کی وجہ سے ہم سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ لیکن یہ بات کہ ہر کام میں خیر و حکمت پوشیدہ ہوتی ہے تو اس پر پورا پورا ایمان اور یقین رکھیں۔ خدا چاہے گا تو وہ آپ پر حکمت بھی واضح کر دے گا۔ لیکن حکمت جاننے کے لیے ہم کو بے صبر نہیں ہونا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ اس راستہ میں آپ دیکھیں کہ ظالموں کی گرتی ہوئی دیوار، باغیوں اور طاغیوں کے گرتے ہوئے وقار کو سنبھالا دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں بھی خدا کی حکمت ہی کارفرما ہو گی۔ ہو سکتا ہے کہ اس راستہ میں آپ دیکھیں کہ اہل حق مظلوم ہیں، مقہور ہیں۔ ان کو ستایا جا رہا ہے، ان کو دکھ دیا جا رہا ہے، وہ فاقے کر رہے ہیں۔ یہ باتیں بھی آپ دیکھیں اور اس پر یہی یقین رکھیں کہ اس میں بھی خدا کی کوئی حکمت ہو گی۔ یہاں مسکینوں کی کشتی میں سوراخ کرا دیا جاتا ہے تو اس کے اندر بھی حکمت مضمر ہوتی ہے۔ ظالموں اور باغیوں کی دیوار اونچی کرا دی جاتی ہے تو بہر حال اس دیوار کے نیچے، غریبوں اور یتیموں کا خزانہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ ظالموں اور طاغیوں کو جو

مہلت دی جاتی ہے، اس کے اندر کیا کیا حکمتیں ہیں تو ان میں سے کچھ کا اندازہ آپ کو قرآن مجید کے مطالعہ سے ہوگا اور اصل حقیقت تو قیامت کے دن ہمارے سامنے آئیگی۔

بہرحال ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اس بات پر ایمان رکھیں کہ اگر حق کی راہ میں کسی پر ظلم ہوتا ہے تو اسی کے اندر حکمت ہے۔ اسی کے اندر بہتری ہے، اسی کے اندر خیر ہے، اسی کے اندر فلاح ہے اور اسی کے اندر کامیابی ہے۔ اور اگر ظالموں کو، طاغیوں کو، سرکشوں کو، نافرمانوں کو، باغیوں کو، غافلوں کو اور بے پرواؤں کو خدا کی طرف سے ڈھیل دی جاتی ہے تو اس کے اندر بھی حکمت ہے، اس پر بھی پورا یقین رکھیے۔ اگر آپ اس بنیادی حقیقت کو پیش نظر رکھیں گے تو یہ چیز ہمیشہ شیطان کے مقابلہ میں آپ کو پناہ میں رکھے گی۔ آپ ثابت قدم رہ سکیں گے۔ اور اگر اس سے غفلت ہوگئی تو شیطان آپ کو ٹھوکر کھلائے گا اور آپ کو دھوکہ دے گا۔ لہٰذا یہ بڑی بنیادی چیز ہے جو آپ کو ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے۔

دوسری ایک اور بات بھی میں آپ کے سامنے واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہم کو اور آپ کو اس دنیا میں اپنا موقف اور مقام بھی طے کر لینا چاہیے کہ ہم اس دنیا میں "کیا" ہیں؟ خالق ہیں؟ ظاہر ہے کہ خالق نہیں ہیں، مخلوق ہیں۔ مالک ہیں؟ ظاہر ہے کہ مالک نہیں ہیں، مملوک ہیں۔ ہمارا صحیح موقف اور صحیح مقام جو قرآن مجید میں سورۂ حدید میں بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ ہم مُسْتَخْلَفٌ ہیں۔ مُسْتَخْلِفٌ نہیں ہیں۔ مُسْتَخْلَفٌ کا مفہوم اگر آپ اردو میں سمجھنا چاہیں تو یوں سمجھ لیجئے کہ ہم امین ہیں۔ ہمیں جتنی قوتیں، صلاحیتیں، اور ذہنی و دماغی قابلیتیں اور جسمانی توانائیاں ملی ہیں، جو مال، دولت، اسباب، سامان، ذرائع اور وسائل ملے ہیں ہم ان سب کے امین ہیں، مالک نہیں۔ اور جب ہم امین ہیں تو ظاہر بات ہے کہ ہمیں ہر امانت کے لیے جواب دہی کرنی ہے۔ ایک ایک چیز کے متعلق حساب دینا ہے۔ امانت دینے والے نے جس حد تک اختیار دیا ہے بے شک اس اختیار کے دائرہ کے اندر ہم اختیار استعمال کرنے کا حق رکھتے ہیں، لیکن اس کے باہر رتی برابر بھی ہٹے تو اس کا حساب دینا ہوگا، جواب دہی کرنی ہوگی اور نتیجہ بھگتنا ہوگا۔ اور کسی ایسے ویسے سے نہیں بلکہ اس ہستی سے بھگتنا ہوگا جو ذرہ ذرہ کا علم رکھتی ہے۔ پھر

یا تو اس بات کا انکار کر دیجئے کہ آپ مستخلف نہیں ہیں بلکہ مالک ہیں۔ ورنہ اپنے سمع پر، اپنے فواد پر، اپنے بصر پر، اپنی ایک ایک چیز پر پہرہ بٹھائیے۔ اپنی زبان پر بھی پہرہ بٹھائیے۔ یہ آپ کی زبان کس کی ترجمان ہے؟ یہ آپ کی عقل کی ترجمان ہے۔ یا آپ کے بطن اور فرج کی ترجمان ہے! ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ نعمت عقل کی ترجمان ہے ہم نے اس کو بطن اور فرج کا غلام بنا کر رکھ دیا ہے۔ اگر موقع ہوتا تو میں تفصیل سے آپ کو بتاتا کہ ہماری شاعری، ہمارا ادب اور ہمارا لٹریچر بالکل ۔۔۔ مہمل گندی، ناپاک اور لغو چیز بن کر رہ گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک شمشیر جوہر دار جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائی تھی، اس تلوار سے ہم نے گھاس کاٹنے کی درانتی کا کام لینا شروع کر دیا ہے۔

بہر حال اس بات کو ملحوظ رکھیئے کہ ایک ایک چیز کے آپ مسئول ہیں۔ جو شخص اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کے قدم جادۂ حق پر استوار رہتے ہیں اور جہاں اس حقیقت سے غفلت ہوئی وہیں وہ فوراً ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ تو اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھیے۔ اس موقف کو، اپنے مقام کو، اپنے درجہ کو، اپنے مرتبہ کو کبھی بھی فراموش نہ کیجئے اور اگر اس کے انکار کی آپ میں ہمت ہے تو میں کسی ایسے دوست کا خیر مقدم کروں گا جو مجھ پر ثابت کر دے کہ اس کے انکار کی عقلی دلیل موجود ہے اور اس کی گنجائش ہے کم از کم قرآن مجید میں، جس پر آپ کا ایمان ہے، اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر یہ قرآن قبروں کے اوپر پڑھ کر صرف ایصال ثواب کے لیے ہے، تب تو میں کچھ نہیں کہتا۔ ان لوگوں کی قبروں پر بھی پڑھ کر اس کے ذریعہ ایصال ثواب کیجئے کہ جنہوں نے ساری عمر کبھی قرآن کو ہاتھ تک نہ لگایا ہو۔ لیکن اگر قرآن زندگی کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے ہے جیسا کہ فی الواقع وہ ہے، حق بتانے کے لیے ہے، صراط مستقیم پر گامزن رکھنے کے لیے ہے۔ مآل کار کا شعور دینے کے لیے ہے۔ تب میں یہ کہتا ہوں کہ آپ کا مستقر، آپ کا مقام اور آپ کا موقف اس قرآن میں یہی بیان کیا گیا ہے جو میں نے عرض کیا ہے۔ اگر کوئی صاحب اس کے برعکس مجھے کوئی بات سمجھا سکیں تو میں ان کا خیر مقدم کروں گا۔ یہ بات بڑی تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت تھی لیکن میں نے مختصراً

عرض کیا ہے، چونکہ مجھ میں زیادہ بولنے کی طاقت نہیں ہے۔

عزیزو! اب ایک حقیقت کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جس کو آپ ہمیشہ پیش نظر رکھیے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ ہر ابنِ آدم اور بنت حوا اس دنیا میں محاذِ جنگ پر ہے، اور بڑے شاطر دشمن کے مقابلہ میں محاذِ جنگ پر ہے۔ بڑے کائیاں دشمن کے مقابلہ میں جس نے خدا کو یہ چیلنج دے رکھا ہے کہ "اگر تو مجھے مہلت دے تو میں اس انسان کے داہنے سے، باہنے سے، آگے سے پیچھے سے اسکے آرٹ سے، ادب سے، لٹریچر سے، ثقافت سے، کلچر سے، غرض کہ ہر پہلو سے، اس کے اوپر تاخت کروں گا۔ اور اسے تیری صراطِ مستقیم سے ہٹا کر چھوڑوں گا۔ اس کو گمراہ کر کے رہوں گا اور ثابت کر دوں گا کہ اس کو میرے اوپر کوئی فضیلت نہیں ہے۔" اللہ تعالےٰ نے اس شان کے ساتھ جو اسی کو زیبا ہے، جواب میں فرمایا کہ "جا تجھے مہلت دی گئی جس کو تو بہکا سکتا ہے۔ بہکا لے جو تیرے پیچھے لگ جائیں گے، میں ان سے اور تجھ سے، تیری ذرّیت سے، تیرے اولیاء سے جہنم کو بھر دوں گا۔" یہ قرآن مجید کی ایک واضح حقیقت ہے، قرآن حکیم میں قصّہ آدمؑ و ابلیس صرف حکایت سنانے کے لیے نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت بیان کرنے کے لیے ہے اس کی بے شمار حقیقتوں میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ آپ اچھی طرح یہ سمجھ لیں کہ آپ اس دنیا میں ایک بڑے شاطر اور کائیاں دشمن کے مقابلہ میں محاذِ جنگ پر ہیں اور دشمن چالاک و مکّار ہونے کے ساتھ طاقتور بھی ہے۔ اس نے جس وقت انسان کو گمراہ کرنے کا چیلنج کیا تھا اور مہلت مانگی تھی تو اس کے چیلے چانٹے گنتی کے ہوں گے، لیکن آج تو اس کی فوج بے شمار ہے۔ پھر اس کی فوج میں ایسے ایسے کائیاں لوگ پیدا ہو گئے ہیں کہ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ وہ آج خود ابلیس کے کان کتر سکتے ہیں۔ ابلیس کو بھی فلسفہ پڑھا سکتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ کائیاں ہیں۔ اب ابلیس کو خود کچھ کرنے کی خاص ضرورت نہیں ہے۔ اس سے زیادہ شاطر اس کے شاگرد ہیں۔ اگر تفصیل کا موقع ہوتا تو میں ان شاگردوں کے کرتوتوں کو ایک ایک کر کے آپ کے سامنے رکھتا اور آپ کو اپنی بات پوری طرح سمجھا دیتا۔ اجمالاً یوں سمجھ لیجئے کہ یہ شاگرد آج آرٹ کے نام سے، ادب کے نام سے، لٹریچر کے

نام سے، ثقافت کے نام سے، کلچر کے نام سے، فیشن کے نام سے، تہذیب کے نام سے، پیٹ کے نام سے، سیکس[1] کے نام سے، جمہوریت کے نام سے، عوام کے نام سے، خود اسلام کے نام سے اور نہ جانے کس کس نام سے خدا کی خلق کو گمراہ کر رہے ہیں اور ابلیس کے کان کتر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ابلیس بھی شاید قیامت کے دن چیخ اُٹھے گا کہ بے شک تم نے مجھے بھی مات دے دی۔ میں بھی تم سے یہ توقع نہیں رکھتا تھا۔ پس اے بھائیو! ایسے چالاک دشمن اور اس کے ایسے لاؤ لشکر کے مقابلہ میں آپ محاذِ جنگ پر ہیں۔ جو سپاہی محاذ جنگ پر رہے وہ واقعہ یہ ہے کہ بدبخت ہے، بدقسمت ہے، نالائق ہے اگر وہ اٹنا غفیل ہو کر اور گھوڑے بیچ کر سو جائے۔ گھوڑے بیچ کر سونے کا کیا موقعہ ہے، جن لوگوں کی صفت یہ تھی کہ وہ دن کو گھوڑے کی پیٹھ پر باطل سے پنجہ آزمائی کرتے تھے اور اللہ کی کبریائی کی شہادت دینے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگاتے تھے اور پھر رات کو مصلّٰی پر اپنے آقا کے حضور کھڑے ہوتے تھے۔ اس سے مناجات کیا کرتے تھے۔ وہ آخر کا ہے کو جاگتے تھے، ان کو آخر کون سا غم تھا، بس ان کو اگر فکر تھی تو یہی کہ بڑے کائیاں دشمن سے مقابلہ ہے۔ بڑے شاطر دشمن سے سابقہ ہے جس کے ایجنٹ شیطانوں میں بھی ہیں جنّوں میں بھی ہیں اور خود انسانوں میں بھی ہیں اور جیسا کہ میں عرض کر چکا آپ کو تو بڑے خطرہ کا سامنا ہے۔ اس زمانہ میں تو ابلیس کے بڑے ہوشیار، چالاک ایجنٹوں کا پورا کا پورا لاؤ لشکر آپ کے داہنے، بائیں، آگے اور پیچھے موجود ہے لہٰذا آپ کے لیے تو از حد ضروری ہے کہ آپ کسی وقت غافل نہ ہوں۔ ہر وقت جاگتے رہیں، ہر وقت ہوشیار رہیں، چوکس اور چوکنے رہیں، محاذِ جنگ پر جس طرح سپاہی سوتا ہے، اسی طرح سوئیں جس طریقہ سے جاگتا ہے۔ اسی طریقہ سے جاگیں۔ یہ اللہ کو معلوم ہے کہ اس مقابلہ میں بالآخر جیتے گا کون اور ہارے گا کون، لیکن آدم کی ناخلف اولاد ہو گا وہ جو اس حقیقت سے غافل ہو۔ یاد رکھیے کہ اس کی یہ غفلت اس کو شیطان کے مقابلہ میں چاروں خانے چت کر دے گی۔

پس، میرے عزیزو! جاگتے رہو۔ آگاہ رہو۔ رات کو بھی، دن کو بھی، سوتے وقت بھی،

---

[1] SEX

جاگتے وقت بھی ہر وقت ہوشیار رہو۔ دائیں، بائیں، آگے پیچھے ہر سمت اور ہر طرف سے چوکنے رہو۔ اگر آپ اس حقیقت کو یاد رکھیں گے تو آپ صراطِ مستقیم پر گامزن رہیں گے۔ یہ بھی یاد رکھیے کہ محاذِ جنگ پر ہر سپاہی کو ہتھیار کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اور آپ کو بھی ہتھیار درکار ہے۔ یہ ہتھیار کیا ہے؟ تو جان لیجئے کہ اللہ تعالےٰ نے شیطان کے چیلنج کے جواب میں جو بات ارشاد فرمائی تھی، وہی ارشاد آپ کے لیے ہتھیار اور وہی چیز آپ کے لیے نسخۂ علاج ہے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا تھا کہ "جا میں انسانوں کی رہنمائی اور مدد کے لیے اپنی ہدایت اور اپنی کتاب نبیوں اور رسولوں کے واسطے سے نازل کروں گا۔ جو لوگ میری کتاب اور میرے انبیاء و رسل کی سنّت کو مضبوطی سے پکڑے رہیں، اُن کو تو ہرگز گمراہ نہیں کر سکے گا ہاں جو میری ہدایت کو چھوڑ دیں گے تو اُن پر تیرا جادو بے شک چل جائے گا۔"

پس شکر کیجئے کہ شیطان کے مقابلہ میں آپ کے پاس اللہ کی آخری کتاب بتمام و کمال موجود ہے اس کتاب کو مضبوطی کے ساتھ پکڑیئے۔ اس کو ایصالِ ثواب کا نسخہ نہ سمجھ لیجئے بلکہ اس کے ایک ایک لفظ کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ اس کے اوامر و نواہی کو معلوم کیجئے۔ اس کے احکام اور ان کی حکمتوں کو جاننے کی سعی کیجئے۔ اس کی دعوت کا شعور حاصل کیجئے۔ بُرے اعمال، نافرمانی، سرکشی، طغیان و بغاوت کے ہولناک انجام سے آگاہی حاصل کیجئے۔ اور ساتھ ہی ساتھ جو کچھ علم حاصل ہوتا رہے اس پر عمل کی جدوجہد شروع کیجئے اور دوسروں تک قرآن کی دعوت کو نہایت دلسوزی کے ساتھ پہنچانے کی فکر کیجئے۔ اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیجئے۔ اس کا حق اسی طرح ادا ہوگا۔ اس کو مضبوطی سے تھام لینے کا یہی مطلب اور مفہوم ہے۔ اس کے برعکس طرزِ عمل اللہ کی کتاب کے ساتھ مذاق ہے۔ اس کی محبت کا دعوےٰ لاف زنی ہے، بے وزن ہے، بے حقیقت ہے جس کا پتہ آخر کار روزِ حساب چل جائے گا۔

عزیزو! اب صرف ایک حقیقت کی اور یاد دلانا چاہتا ہوں اور وہ محض میرا تاثر نہیں ہے بلکہ میرے نزدیک ایک زندہ حقیقت ہے اور وہ یہ ہے کہ ہماری پوری قوم کے اوپر اس وقت اُس قسم کے حالات پیش آ رہے ہیں جس قسم کے منذرات، تنبیہات اور جس قسم کے

تازیانے بنی اسرائیل پر ہوئے تھے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس دنیا میں دعوت الی اللہ کی وراثت بنی اسرائیل سے چھین کر آپ کو دی گئی تھی۔ سورۂ مائدہ آپ نے پڑھی ہو گی پھر پڑھ لیجئے۔ اس میں اللہ تعالےٰ نے صاف صاف فرما دیا ہے کہ "میں نبی اسرائیل سے ان کی نافرمانی، کج روی اور خیانت کی وجہ سے یہ امانت چھین کر اب تمہارے حوالے کرتا ہوں لیکن اگر تم نے مجھ سے نقضِ عہد کیا، میری کتاب کو چھوڑا، میرے نبی سے منہ موڑا، میری شریعت کے ساتھ بغاوت کی، میرے ساتھ مکاری اور چالاکی کی تو تمہارے ساتھ بھی وہی معاملہ ہو گا جو بنی اسرائیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔" میرا تاریخ کا جو مطالعہ ہے اور تاریخ سے میری مراد وہ تاریخ ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے اور کسی تاریخ کا میں عالم نہیں ہوں۔ اس مطالعہ کی روشنی میں میں کہہ سکتا ہوں کہ اس قوم پر اسی طرح کے حالات پیش آ رہے ہیں جس قسم کے حالات بنی اسرائیل کو پیش آئے تھے۔ یہ بڑا نازک وقت ہے میرے عزیزو! کسی غلط فہمی میں نہ مبتلا ہو۔ اس طرح کے واقعات، حالات اور حادثات چند خاص اشخاص و افراد کی غلطیوں کا نتیجہ نہیں ہوتے اور نہ ہی چند خاص اشخاص و افراد کی غلطیوں کے ایسے بھیانک نتائج نکلتے ہیں۔ بلکہ یہ صورتِ حال پوری کی پوری قوم کے شامتِ اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بڑے ہی نادان ہیں، وہ لوگ جو چند اشخاص و افراد کو موردِ الزام گردان کر سارا زور بس ان کو مجرم ثابت کرنے پر لگا رہے ہیں۔ گویا باقی سب خیر سلّا ہے۔ حالانکہ یہ منذرات، یہ تنبیہات، یہ حادثات، یہ واقعات پوری قوم کی نافرمانی، سرکشی اور کرتوت کے نتیجے میں رونما ہوئے ہیں۔ ذرا غور تو کرو کہ ایک ہزار سال بعد ہم نے ہندو قوم کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے وہ بھی ایک عورت کے آگے۔ تقریباً ایک لاکھ اپنے لوگ بطورِ قیدی پکڑوا دیئے۔ آدھے سے زیادہ ہمارا ملک ہاتھ سے نکل گیا۔ یہ معمولی واقعات نہیں ہیں۔ بھائیوں کے ہاتھوں جس طریقہ سے بھائیوں کا خون خچرا ہوا ہے، عزتیں پامال ہوئی ہیں۔ اعوذ باللہ میں سچ کہتا ہوں کہ جو بھیانک واقعات اخبارات میں آئے ہیں اگر ان کا پانچ فیصد بھی صحیح ہے تو کلیجہ شق کر دینے کو کافی ہے لیکن ذرا غور کرو کہ ان کا کتنا تاثر ہماری قوم نے لیا ہے۔ اس وقت اس بچے کھچے ملک کے حصّہ میں جو کچھ ہو رہا ہے

وہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ اللہ اکبر۔ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ زبان کی بنیاد پر، نسل کی بنیاد پر، کلچر کی بنیاد پر، علاقہ کی بنیاد پر جو امت محمدؐ، کلمہ لا الہ الا اللہ، محمد رسول اللہ پر جمع کی گئی تھی جس کا کلمہ ایک، کتاب ایک، رسول ایک، قبلہ ایک، آج وہ کس طرح شیطان کے نرغہ میں پھنسی ہوئی ہے۔ بھائیو! میں پھر کہتا ہوں کہ یہ بڑا نازک وقت ہے، یہ اصلاح حال کا وقت ہے، یہ جوڑنے اور ملانے کا وقت ہے، یہ نفرت دلانے اور ایک دوسرے پر الزام لگانے کا وقت نہیں۔ اس سے آخر قوم کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے کہ ہم کسی ایک طبقے یا گروہ کو ملزم قرار دیں اور ان کو مجرم ثابت کریں کہ ساری خرابیوں کا باعث تم ہو اور وہ ہم پر الزام لگائیں اور ہمیں مجرم ثابت کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم سب کے سب مجرم ہیں، پوری کی پوری قوم مجرم ہے۔ ہم سب اللہ کے نافرمان ہیں۔ پس ہم سب کو اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے، اس سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرنی چاہیے۔ اس کی جناب میں ہم سب کو توبہ اور استغفار کرنا چاہیے۔ ہم سب کو اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہو جانا چاہیے اگر ایسا نہ کیا گیا اور جس کے دُور دُور بھی آثار نہیں ہیں تو جان لینا چاہیے کہ حقیقت یہ ہے کہ قوم کی کشتی بالکل بھنور میں ہے، گرداب میں ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ڈوبی، تب ڈوبی، معلوم نہیں کہ آپ لوگوں کو بھی یہ حقیقت نظر آتی ہے یا نہیں، مجھے تو رات کے اندھیارے اور دن کے اُجالے میں بصارت سے بھی اور بصیرت سے بھی یہی حقیقت نظر آتی ہے۔

عزیزو! آج وقت ہے کہ یوحنا مسیح کی طرح سے آپ کے اندر سے وہ لوگ اٹھیں جو پوری قوم میں توبہ کی منادی کریں، استغفار کی منادی کریں، اللہ سے اپنے تعلق کو استوار کرنے کی منادی کریں، نبی سے اپنی نسبت کے حقیقی تعلق جوڑنے کی منادی کریں، خلاف دین، خلاف اسلام کاموں سے اجتناب کی منادی کریں، سرکشی و نافرمانی سے بچنے کی منادی کریں، حلال و حرام کی تمیز کی منادی کریں، اس وقت ان کاموں کے سوا دوسرے کام بالکل فضول ہیں شاطر اسی طرح لڑتے رہیں گے اور ایک سے ایک بڑا عذاب مختلف شکلوں میں آتا رہے گا۔ ایسے بگڑے ہوئے معاشرہ میں جو شخص و افراد مسلط ہوں گے وہ بھی اللہ کے قہر کی نشانیاں ہوں گے کسی کے اندر خیر نہیں ہے۔ ایک پارٹی اگر جائے گی تو جس طریقہ سے شر، فساد کے

ساتھ آئی ہے۔ کوئی دوسری پارٹی بھی اسی طرح کے شر اور فساد کے ساتھ ممکن ہے مسلّط ہو جائے۔ لیکن اس وقت محض ہاتھوں کے بدلنے میں بھلائی نہیں ہے۔ ملک کے لیے کوئی خیر نہیں ہے، ملک کی بھلائی اگر ہو گی تو ان ہی بے غرض لوگوں کے ہاتھوں ہو گی جو آج یوحنا و مسیح کی طرح توبہ کی منادی کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ جو صاف صاف، بالکل حق، واضح طور پر بڑوں کے سامنے، چھوٹوں کے سامنے، پوری قوم کے سامنے وہی بات پیش کریں جو حق ہے۔ جو دین کا تقاضا ہے، جو ایمان کا تقاضا ہے، لیکن جان رکھو کہ یہ راستہ آسان نہیں ہے، بہت کٹھن ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس راہ میں تمہارے سر کاٹ کر ظالم لوگ اپنی معشوقاؤں کے سامنے تحفہ کے طور پر پیش کریں۔ ہو سکتا ہے کہ اس راہ میں تمہیں سُولی پر چڑھنا پڑے۔ ہو سکتا ہے کہ اپنے وطن سے نکال دیئے جاؤ۔ معلوم نہیں کہ اس راہ میں کیا کیا پیش آئے گا۔ بدر و اُحد۔ خندق و حنین، اس راہ کی لازمی منازل ہیں۔ مستقبل کا علم صرف اللہ کو ہے لیکن جو کچھ ہو گا اسی کے اندر تمہارے لیے خیر اور اسی کے اندر فوز و فلاح ہے۔ اس بات پر یقین رکھو۔ قرآن کی دعوت اور توبہ کی منادی کا کام لے کر اُٹھ کھڑے ہو جاؤ۔ شاید اللہ تعالیٰ تمہاری اس سرفروشانہ ادا کو پسند فرمالے اور تمہاری قوم کو بچا لے، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ قوم کی کشتی بھنور میں ہے۔

آخر میں، میں اپنے لیے اور آپ کے لیے، دونوں کے لیے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو حق کی معرفت عطا فرمائے اور حق پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین!

وَ اٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن!

نشر القرآن کیسٹ سیریز ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

دین کے انتہائی اہم اور بنیادی موضوع

حقیقتِ ایمان پر ڈاکٹر اسرار احمد

کے ایک ایک گھنٹے کے چار لیکچرز جو C-90 کے چار کیسٹوں میں دستیاب ہیں
ہدیہ پاکستانی کیسٹ -/۷۰ روپے (جاپانی کیسٹ) -/۱۳۰ روپے مع محصول ڈاک

تین سو سے زائد عنوانات پر مشتمل فہرست طبع شدہ موجود ہے۔ خط لکھ کر طلب فرمائیں

خطابِ جمعہ

(۲)

ڈاکٹر اسرار احمد

یزید کی ولی عہدی اور سانحۂ کربلا کا تاریخی پس منظر

فلسفۂ انقلاب کی روشنی میں

تلخیص و ترتیب: مقبول الرحیم مفتی

جمعہ ۱۹ ستمبر کا زیرِ نظر خطاب دراصل گزشتہ جمعہ کے خطاب کا تتمہ تھا جسے ہم ماہِ نومبر کے میثاق میں "شہادتِ حضراتِ عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ کا تاریخی پس منظر" کے عنوان سے نذرِ قارئین کر چکے ہیں۔ اس خطاب کی اشاعت کیساتھ اس موضوع پر گفتگو مکمل ہو رہی ہے۔

(ادارہ)

یزید کی ولیعہدی ۴۱ھ سے ۵۱ھ ہجری تک کوئی اختلاف رونما نہیں ہوا۔ تمام امت ایک جھنڈے تلے جمع تھی اور باہمی اتحاد کی کیفیت مثالی تھی۔ حضرت معاویہؓ کے تعلقات حضرت علیؓ کے دونوں صاحبزادوں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے ساتھ انتہائی خوشگوار تھے۔ یہ دونوں حضرات دمشق جاتے تھے اور حضرت معاویہؓ اُن کا اکرام فرماتے تھے، بڑے بڑے ہدایہ پیش کرتے تھے۔ ایک بہت اہم بات یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت حسنؓ کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ اور وہ قطعاً کسی موروثی اور خاندانی بادشاہت کی بنیاد رکھنے کے خواہش مند نہیں تھے۔ لیکن حضرت حسنؓ کی وفات کے بعد پھر سوال پیدا ہوا کہ آیا امت کی قیادت کا مسئلہ حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے یا اس مسئلے کو طے کر دیا جائے۔ اس موقع پر کچھ حضرات نے حضرت معاویہؓ کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی کہ وہ اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین مقرر کر دیں۔ تجویز پیش کرنے والوں میں ایک جلیل القدر

صحابی حضرت مغیرہ ابن شعبہؓ بھی شامل ہیں۔ ان کا تعلق نہ بنو ہاشم سے ہے نہ بنو امیہ سے۔ یہ طائف کے رہنے والے ثقفی ہیں۔ ان کے شرفِ صحابیت کا اندازہ بھی اس بات سے کر لیجئے کہ یہ بیعت رضوان میں شامل تھے۔ بیعتِ رضوان ۶ سنہ ہجری میں ہوئی اور اس وقت گفتگو ہو رہی ہے ۵۱ھ کی۔ ان کا ۴۵ برس کا کردار سامنے ہے اور ہر چیز سے بڑھ کر اصحابِ بیعتِ رضوان کے حق میں اللہ کی گواہی قرآن حکیم میں ثبت ہے کہ:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ	(اے پیغمبر) اللہ مومنوں سے راضی
اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ	ہوگیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے
فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ	بیعت کر رہے تھے۔ ان کے دلوں کا
السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ	حال اس کو معلوم تھا۔ اس لئے اس نے
فَتْحًا قَرِيْبًا ۝	ان پر سکینت نازل فرمائی اور انعام میں
(سورۃ الفتح آیت ۔ ۱۸)	قریبی فتح عطا کی۔

پورے دورِ خلافت راشدہ میں حضرت مغیرہؓ ابن شعبہؓ کے پاس اہم عہدے رہے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہؓ (نعوذ باللہ) عہدوں اور مناصب کے بھوکے تھے۔ اس وقت ان کی عمر بھی لگ بھگ ستر برس تھی۔ انتہائی مدبر اور معاملہ فہم شخصیت کے مالک تھے۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے اختلافات میں انہوں نے حضرت علیؓ کا ساتھ دیا تھا۔ آج کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت مغیرہؓ ابن شعبہ نے اپنی گورنری بچانے کے لئے یہ مشورہ دیا تھا۔ کہنے والے یہ بھی نہیں سوچتے کہ یکے از اصحابِ بیعت رضوان کے بارے میں وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ہم تو اصحابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ گمان بھی نہیں کر سکتے۔ حضرت مغیرہؓ ابن شعبہ کے مشورے کے باوجود حضرت معاویہؓ متردد رہے۔ اس کے بعد مملکتِ اسلامیہ کے مختلف علاقوں سے وفود آنے لگے جنہوں نے یہی مشورہ دیا۔ یہاں تک کہ حضرت معاویہؓ نے یزید کو اپنا جانشین نامزد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اہلِ سنّت کا مسلک یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کا یہ فیصلہ اجتہاد پر مبنی ہے۔ وہ حضورؐ کے صحابی ہیں۔ ارشادِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم "الصحابۃ کلھم عدول" کی روشنی میں کسی صحابی کی نیت پر ہم شک کریں گے تو ہمارا ایمان محفوظ نہیں۔ ہاں اجتہادی غلطی ہو سکتی ہے لیکن خطائے اجتہادی پر بھی مجتہد کو اکہرا ثواب ملتا ہے اور اگر اجتہاد درست ہو تو دہرا ثواب ملتا ہے۔ اس اجتہاد کے حق میں جو دلائل ہیں ان پر تفصیلی گفتگو میں "سانحہ کربلا"

نامی کتابچہ میں کر چکا ہوں۔ جس شخصیت نے ۲۰ برس تک بلخ و بخارا سے لے کر بحر اوقیانوس تک اور یمن سے لے کر ایشیائے کوچک تک پھیلی ہوئی تاریخ کی عظیم ترین سلطنت پر حکومت کی ہو، کیا وہ سیاست و تدبّر سے، معاملہ فہمی سے اور دور اندیشی سے تہی دست ہو سکتی ہے! حضرت معاویہؓ نے دیکھا کہ کبار صحابہ کی پہلی نسل بالعموم اس دنیا سے جا چکی، اب ان کی اگلی نسل کے کچھ بزرگ موجود ہیں۔ مثلاً حضرت علیؓ جا چکے ان کے بیٹے حضرت حسینؓ موجود ہیں، حضرت زبیرؓ جا چکے، عبداللہ ابن زبیر موجود ہیں۔ حضرت عمرؓ اللہ کے پاس جا چکے ان کے صاحبزادے عبداللہؓ موجود ہیں۔ دوسری طرف عالم اسلام بہت وسیع ہو چکا۔ اس کی عظیم اکثریت نومسلموں پر مشتمل ہے۔ اس لئے حکومت کی وہ آئیڈل صورت جو عہدِ خلافتِ راشدہ میں پائی جاتی تھی اب برقرار نہیں رہ سکتی جب تک اس کی پشت پر کسی طاقتور قبیلے کی حمایت موجود نہ ہو۔ میرے نزدیک یہ تھیں وہ وجوہات جن کی بنا پر حضرتِ معاویہؓ نے یہ اجتہاد کیا۔ لیکن اگر کوئی کہے کہ ان سے غلطی ہو گئی تھی تو میں اس سے لڑوں گا نہیں۔ اگر غلطی تھی بھی تو اجتہادی غلطی تھی۔ حضرتِ معاویہؓ کے اس فیصلے سے صرف پانچ اصحابؓ نے اختلاف کیا۔ انہوں نے یزید کی ولی عہدی کی بیعت نہیں کی۔ ان میں حضرت صدّیق اکبرؓ کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمٰنؓ، حضرتِ عمرؓ کے فرزند حضرت عبداللہؓ، حضرت عباسؓ کے بیٹے حضرت عبداللہ، حضرت زبیرؓ کے لختِ جگر حضرت عبداللہؓ اور حضرت علیؓ کے نورِ نظر حضرت حسینؓ شامل تھے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکرؓ کا یہ تبصرہ بھی روایات میں موجود ہے کہ "یہ قیصر و کسریٰ کی سنّت کو جاری کیا جا رہا ہے۔"

یزید کی ولی عہدی کی بیعت کے بعد حضرت معاویہؓ دس برس زندہ رہے لیکن انتہائی تدبّر اور دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے انہوں نے اس معاملے میں کسی پر کوئی سختی یا تشدّد نہیں کیا اور نہ ہی حضرت حسینؓ یا بیعت نہ کرنے والے دیگر اصحاب میں سے کسی نے اس فیصلے کے خلاف کوئی احتجاج یا ہنگامہ کرنے کی کوشش کی

حکومتِ یزید اور اختلافِ صحابہؓ جب حضرت معاویہؓ کا انتقال ہوا تو ایک حقیقی صورتحال نمودار ہوئی۔ پھر اجتہاد کا مرحلہ آیا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکرؓ کا انتقال ہو چکا تھا۔ باقی چاروں حضرات نے جو اجتہادی رائے قائم کی اسے بھی سمجھ لیجئے۔ حضرت عبداللہؓ ابن عباسؓ اور حضرت عبداللہؓ ابن عمرؓ دونوں کی رائے یہ ہوئی کہ اگرچہ فیصلہ غلط ہوا ہے لیکن کوئی کفر بھی نہیں ہوا، اتنا غلط بھی نہیں ہوا کہ ہم بغاوت کر دیں اور

ملّتِ اسلامیہ کے اندر کوئی اختلاف و افتراق اور ہنگامہ کھڑا کر دیں۔ ان دونوں اصحاب کے علم و فضل اور مقام و مرتبے کو بھی دیکھ لیجئے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس "حبر الامة"[1] کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ ہماری تفسیری روایات کے سب سے بڑے راوی ہیں۔ آپ کے بارے میں حضورؐ کی دعا کتبِ احادیث میں موجود ہے کہ اَللّٰھُمَّ فَقِّھْهُ فِی الدِّیْنِ وَ عَلِّمْهُ التَّاوِیْلَ[2] (اے اللہ اس کو دین کی سمجھ عطا کر دے اور علم تاویل سکھا دے) کیا رسولؐ کی دعا قبول نہ ہوئی ہوگی! خاندانی قرابت بھی دیکھ لیجئے۔ والدؓ کی طرف سے حضرت حسینؓ کے چچا ہیں اس لئے کہ حضرت علیؓ ابن ابی طالب اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ دونوں چچا زاد بھائی ہیں۔ والدہؓ کی طرف سے حضرت حسینؓ کے نانا ہیں اس لیے کہ محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے بھی چچا زاد بھائی ہیں۔ یہ ہیں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ — حضرت عبداللہؓ ابن عمرؓ حدیث کے مستند ترین مختصر ترین اور مشہور سلسلہ روایت — سلسلۃ الذہب (سنہری زنجیر) کی پہلی کڑی ہیں امام مالکؒ عن نافعؒ عن عبداللہؓ ابن عمرؓ عن رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم)

اُس کے برعکس حضرت عبداللہؓ ابن زبیرؓ اور حضرت حسینؓ ابن علیؓ کی رائے یہ تھی کہ اس غلط فیصلے کے خلاف ہمیں کھڑے ہو جانا چاہئے۔ چاروں حضرات نے اپنی اپنی اجتہادی رائے قائم کی۔ غلط کون تھا اور صحیح کون! اس کا فیصلہ ہم نہیں کر سکتے۔ یہ فیصلہ تو اللہ کے ہاں ہوگا۔ ان کی اجتہادی رائے سے اتفاق یا اختلاف کرنے کا حق ہر ایک کو حاصل ہے۔ لیکن ان کی نیت پر حملہ کرنا ہمارے ایمان کے لیے خطرہ ہے۔ یہ اصحاب رسولؐ ہیں۔ ان کی تربیت، ان کا تزکیۂ نفس اور تجلیۂ روح محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم نے سرانجام دیا ہے۔ ان کی نیت پر حملہ حضورؐ پر حملہ ہے۔ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی شخصیت و مقام کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ انکے والد حضرت زبیرؓ بن عوام جلیل القدر

---

[1] عربی زبان میں حبر کے لغوی معنیٰ "دوات کی روشنائی" ہے۔ قدیم زمانے میں یہ لفظ استعارۃً ان بڑے علماء کے لیے استعمال ہوتا تھا جو تصنیف و تالیف کے کام میں روشنائی استعمال کرتے تھے۔ اس کی جمع احبار ہے۔

[2] علومِ قرآن میں تاویل کا لفظ عام طور پر تفسیر کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے۔ تفسیر سے مراد آیاتِ قرآنی کی ایسی تشریح و توضیح ہے جو قطعی اور یقینی ہو اور تاویل سے مراد ایسی ظنّی تشریح و توضیح ہے جس کی بنیاد عقل پر ہو مگر وہ مسلّماتِ شرعیہ و لغویہ سے متعارض نہ ہو۔ امام ابن تیمیہؒ تاویل سے آیات کے مصداقاتِ خارجیہ مراد لیتے ہیں۔

صحابی، ان کی والدہ جلیل القدر صحابیہ حضرت اسماءؓ، خلیفۃ الرسول حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بڑی صاحبزادی اور زوجۂ رسولؐ حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن ۔ ایک نواسۂ رسولؐ ہیں حضرت حسینؓ اور ایک نواسۂ صدیقِ اکبر ہیں حضرت عبداللہؓ ابن زبیرؓ۔ ان دونوں کا فیصلہ تھا کہ ہمیں یزید کی خلافت قبول نہیں۔ اب وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ نواسۂ صدیقِ اکبرؓ نے نواسۂ رسولؐ کو پیش کش کی کہ میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔ آپ یہیں پر قیام کیجیے۔ حجاز کی مقدس سرزمین کو اپنا مرکز بنائیے۔ یہاں بزرگ صحابہ کرام موجود ہیں۔ یہاں حرمین شریفین ہیں۔ ہمیں جو مزاحمتی تحریک چلانی ہے یہاں سے چلائیں گے۔

سانحۂ کربلا میں اہلِ کوفہ کا کردار

حضرت حسینؓ کا اپنا اجتہاد تھا انہوں نے سبائیوں کے مرکز کوفہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ کوفہ کیا تھا ایرانی نیشنلزم کے انتقام اور یہودی سازش کا مقامِ اتصال۔ ایرانیوں کی شاہ پرستی کا عالم آج بھی دیکھ لیجیے آج کے ایران میں شاہ کا بیٹا ایرانی ٹیلیویژن پر ظاہر ہو گیا۔ اسی سے چودہ سو برس پہلے کے جذبات کا اندازہ کر لیجیے۔ حضرت معاویہؓ کے بیس سالہ عہدِ حکومت میں انہیں اپنی ریشہ دوانیوں کا کوئی موقعہ نہیں مل سکا تھا۔ ان کی وفات پر انہوں نے فوراً خطوط کا ایک سلسلہ قائم کر دیا حضرت حسینؓ کے نام کہ آپ جلد از جلد تشریف لائیے۔ ہم نے کسی کی بیعت نہیں کی۔ ہم بسر و چشم آپ کی بیعت کریں گے۔ حالات کی تفتیش کے لئے حضرت حسینؓ نے حضرت مسلم بن عقیل کو بھیجا۔ ان کے ہاتھ پر ہزاروں لوگوں نے بیعت کر لی۔ انہوں نے فوراً حضرت حسینؓ کو پیغام بھیج دیا۔ لیکن جونہی یزید نے عبیداللہ ابن زیاد کو گورنر بنا کر بھیجا ان کی وفاداریوں کا مجمع اتر گیا۔ نئے گورنر نے کسی کو قتل نہیں کیا قید نہیں کیا۔ محض ایک دھمکی دی اور سب کے سب حضرت حسینؓ کی بیعت سے دستبردار ہو گئے۔ حضرت مسلم بن عقیل کو پناہ دینے والا کوئی نہ رہا۔ انتہائی کسمپرسی کے عالم میں انہیں شہید کر دیا گیا۔ جب انہیں ابن زیاد کے پاس لے جایا جا رہا تھا تو ایک کوفی نے انہیں روتا دیکھ کر پھبتی کسی کہ حکومتوں کے طلبگار رویا نہیں کرتے۔ انہوں نے فوراً جواب دیا بدبخت میں اپنے لئے نہیں رو رہا، میں حسینؓ کے لئے رو رہا ہوں۔ میں انہیں پیغام بھیج چکا ہوں۔ وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ روانہ ہو چکے ہوں گے۔ اب خود اندازہ کیجیے سازشی کون تھا! جبکہ اس کے مقابلے میں مکہ میں حضرت عبداللہؓ ابن زبیرؓ کی حکومت بارہ برس تک قائم رہی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ پورے حجاز اور عرب کے بعض دوسرے علاقوں کے مسلمانوں نے بھی ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ اگر صدیقِ اکبرؓ کے

نواسے کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے بھی دنیا میں موجود رہتے تو یہ کتنی بڑی قوت بن جاتی۔ شاید کہ ملوکیت کا سلسلہ اسی وقت ختم ہو جاتا اور کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اگر حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ حضرت حسینؓ کا ساتھ دیتے تو کربلا کا سانحہ پیش نہ آتا لیکن یہ فیصلہ کہیں اور ہوتا ہے۔ کوئی چیز ہونی ہوتی ہے تو وہ ہو جاتی ہے۔ یہ تقدیر کی باتیں ہیں۔

سانحۂ کربلا کی شخصیتوں کو پہچانئے۔ پہلی شخصیت ہے کوفے کا گورنر ابن زیاد یعنی زیاد کا بیٹا۔ دوسری شخصیت جسے لشکر دے کر حضرت حسینؓ کا مقابلہ کرنے بھیجا گیا، ابن سعد یعنی سعد کا بیٹا۔ سعدؓ کون؟ سعدؓ بن ابی وقاص۔ صحابیٔ رسولؐ فاتح ایران۔ پھر ایک نام آتا ہے شمر کا۔ پھر ایک نام آتا ہے حُر کا۔ یہ چاروں نام اس سانحہ میں بہت اہمیت کے حامل ہیں لہٰذا اس وقت ہم انہی چاروں کا تعارف حاصل کرتے ہیں۔

ابنِ زیاد کا کردار عبیداللہ ابن زیاد یعنی زیاد کا بیٹا عبیداللہ۔ پہلے باپ کو پہچانئے! پھر بیٹے کو۔ زیاد کا نام ابتدا میں زیاد ابنِ سمیّہ یا زیاد ابن اب تھا۔ اس لئے کہ وہ مجہول النسب تھا۔ معلوم نہیں تھا کہ باپ کون ہے۔ اس ضمن میں یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ دورِ جاہلیت میں ابوسفیان کہیں مہمان گئے۔ وہاں عرب کے رواج کے مطابق رات کو انہیں سمیّہ نامی لونڈی پیش کی گئی۔ وہ ابوسفیان سے حاملہ ہوئی اور جو لڑکا پیدا ہوا اس کا نام تھا زیاد۔ کنیز چونکہ کسی اور کی تھی اور اسے بھی یہ معلوم تھا کہ یہ لڑکا میری صلب سے نہیں ہے اس لئے لڑکے کا نسب رواج کے مطابق باپ کی بجائے ماں سے منسوب کیا گیا۔ یا یہ کہا گیا کہ زیاد ابنِ اب یعنی زیاد اپنے باپ کا بیٹا۔ حضرت ابوسفیانؓ بھی اس حقیقت سے باخبر تھے اور انہوں نے حضرت معاویہؓ کو بھی بتا دیا تھا کہ یہ شخص میری صُلب سے ہے۔ میرا بیٹا ہے۔ یہ شخص بہت ذہین، معاملہ فہم اور ذکی تھا۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں کئی مناصب پر فائز رہا۔ پھر حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں بصرے کا گورنر تھا۔ اس ضمن میں ایک اہم اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے جھگڑے میں اس نے حضرت علیؓ کا ساتھ دیا حتیٰ کہ حضرت حسنؓ اور حضرت معاویہؓ کی صلح کے بعد بھی ایک عرصے تک اس نے حضرت معاویہؓ کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا۔ ترکستان کے علاقے میں اپنا مرکز بنا کر باغیانہ سرگرمیاں جاری رکھیں۔ آخر کار حضرت مغیرہ ابن شعبہ کی کوششوں سے یہ دمشق میں حضرت معاویہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت معاویہؓ نے اپنے والد کی وصیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے اسے اپنا بھائی تسلیم کیا اور یوں اس صلح کے نتیجے میں اسے زیاد بن ابی سفیانؓ کے طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ ۵۳ھ میں زیاد

کا انتقال ہوا۔ اس کا بیٹا ہے عبید اللہ ـــ ابن زیاد گورنر کوفہ ـــ میں سمجھتا ہوں کہ یہ شخص یقیناً اس سازش کے اندر شریک ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یزید نے سانحۂ کربلا کے بعد اس شخص کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: اللہ سمیّہ کی نسل پر لعنت کرے۔ اس نے وہ کچھ کیا جس سے کم پر میں راضی ہو سکتا تھا۔ لیکن نوٹ کیجئے کہ یزید دمشق میں ہے اور یہ معاملہ ہوا کوفے کے قریب کربلا میں۔ سینکڑوں میلوں کا فاصلہ ہے۔ آج کل کی طرح مرکز سے ہر وقت رابطہ ممکن نہیں۔ ایک حکم ملا ہوا ہے کہ حضرت حسینؓ سے بیعت لینی ہے۔ اس حکم کی آڑ میں اس نے ساری من مانی کی۔ اس نے پہلا لشکر بھیجا عمرو بن سعدؓ بن ابی وقاص کی قیادت میں۔ یہ لشکر رَے پر حملے کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ ابن زیاد نے اسے کربلا کی طرف روانہ کر دیا۔ عمرو بن سعدؓ نے کوشش کی کہ حضرت حسینؓ سے مصالحت ہو جائے اسی لشکر کے ہراول دستے کے طور پر حُر آئے تھے۔ ان کے والد کا نام بھی یزید تھا جسے آج گالی بنا دیا گیا ہے ـــ حُر بن یزید تمیمی ـــ حضرت حُر نے حضرت حسینؓ کی تقریریں سنیں اور حضرت حسینؓ کے لشکر میں شامل ہو کر جام شہادت نوش کیا۔ آئے تو وہ بھی تھے ابن زیاد کے بھیجے ہوئے لشکر کے ساتھ۔ لیکن لشکر میں لوگ ملے جلے ہوتے ہیں۔ ان میں سازشی بھی ہوتے ہیں۔ لشکر میں ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں معلوم ہی نہیں کہ ہو کیا رہا ہے۔ انہیں تو یہی بتایا گیا ہے کہ کوئی بغاوت ہے اسے فرو کرنا ہے۔ آج بھی ہر سپاہی کو تو ملٹری آپریشن کا مقصد نہیں بتایا جاتا۔ عمرو بن سعدؓ نے جب لیت و لعل کی پالیسی اختیار کی تو ابن زیاد نے غصے سے بھرا ہوا خط لکھا کہ اگر تم فیصلہ کن اقدام نہیں کر سکتے تو قیادت شمر ذی الجوشن کے حوالے کر دو۔ اس وقت عمرو بن سعدؓ حضرت حُرؒ والا راستہ بھی اختیار کر سکتے تھے۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکے۔ ان کا منصب ان کے پاؤں کی بیڑی بن گیا۔

حضرت حسینؓ کی شرائط اور سبائیوں کا ردِّعمل

اب آئیے معاملے کی اصل حقیقت کی طرف۔ حضرت حسینؓ نے کوفیوں کے لشکر کے سامنے تقریریں کیں۔ ایک ایک کوفی کا نام لے کر کہا کہ اے فلاں ابن فلاں کیا تم نے مجھے خط نہیں لکھے تھے۔ یہ تمہارے خطوط میرے پاس موجود ہیں۔ انہوں نے کہا نہیں نہیں تم جھوٹ بولتے ہو ہم نے کوئی خط نہیں لکھا۔ درحقیقت حضرت حسینؓ کی پیشکردہ تینوں شرائط میں سے کسی ایک کی منظوری کی صورت میں ان سبائی کوفیوں کو اپنی سازش کا بھانڈہ پھوٹتا نظر آ رہا تھا۔ حضرت حسینؓ نے تو پیشکش کی تھی کہ مجھے واپس لوٹ جانے دو وہاں جہاں سے میں آیا ہوں، یا مجھے دمشق جانے

دو میں یزید سے خود معاملہ طے کرلوں۔ بعض روایات میں تو یہاں تک الفاظ آتے ہیں کہ میں اسی طرح اُس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دوں جس طرح میرے بھائی نے اس کے باپ کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تھا اور اگر یہ بھی قبول نہیں تو مجھے جہاد کے لئے سرحدوں پر جانے دو تاکہ توسیع انقلاب محمدی علیہ الصلوٰۃ والسلام میں اپنی زندگی کھپا دوں اور اندر کے ان خرخشوں سے میرا دامن صاف ہو جائے۔ وہ سازشی کوفی جنہیں صلح کی صورت میں اپنا بھانڈا پھوٹتا نظر آتا تھا انہوں نے جلدی مچائی، صلح نہیں ہونے دی۔ انہوں نے حضرت حسینؓ اور ان کے قافلے کو شہید کیا ہے۔ یہ سب عبداللہ ابن سبا کے پیروکار تھے۔ یہ مسلمانوں کی خانہ جنگی نہیں تھی بلکہ سبائیوں کی بہت بڑی سازش تھی۔

مماثلتِ معاویہؓ و حسینؓ ایک اہم نکتہ جو "سانحۂ کربلا" میں بیان نہیں ہوا یہ ہے کہ حضرت حسینؓ سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ یہیں ہتھیار ڈال دو، 'SURRENDER' کر دو۔ یہ بات صرف ان کی شجاعت اور حمیت کے منافی ہی نہیں تھی بلکہ حضرت حسینؓ کو صاف نظر آ رہا تھا کہ اپنے آپ کو ان لوگوں کے حوالے کر دینے کے بعد انہیں یزید تک نہیں جانے دیا جائے گا بلکہ یہیں ان کی گردن اڑا دی جائے گی۔ لہٰذا حضرتِ حسین نے فیصلہ کیا کہ اگر مرنا ہی ہے تو اس طرح نہیں مرنا بلکہ بقول شاعر ؎

مرنے چلے تو سطوتِ قاتل کا خوف کیا — اتنا تو ہو کہ باندھنے پائے نہ دست و پا
مقتل میں کچھ تو رنگ جمے جشنِ رقص کا — آلودہ خوں سے پنجۂ صیاد کچھ تو ہو
خوں پر گواہ دامنِ جلاد کچھ تو ہو — جب خوں بہا طلب کریں بنیاد کچھ تو ہو

حضرت حسینؓ کو اس طرح لاچار ہو کر مرنا پسند نہیں تھا۔ اگر حضرت حسینؓ ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے تو کوفی انہیں اپنے خلاف دستاویزی ثبوت لے کر دمشق کے دربار تک کبھی جانے نہ دیتے فوراً ان کی گردن اڑا دیتے۔ لہٰذا حضرت حسینؓ نے شجاعت کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے، اپنی جان اور اپنی آن کی مدافعت کرتے ہوئے، عزّت کے ساتھ شہادت کی موت کو خوش آمدید کہا۔ حضرت علیؓ کے مقابلے میں حضرتِ معاویہؓ کی کیفیت بھی کچھ یہی تھی۔ حضرت معاویہؓ کو نظر آ رہا تھا کہ حضرتِ علیؓ کو سبائی سازشیوں نے گھیرے میں لیا ہوا ہے۔ یہ سبائی ہی تھے جو ہر موقعے پر صلح کے راستے میں رکاوٹ ڈالتے تھے۔ ورنہ جنگِ جمل کے موقع پر بھی صلح ہو رہی تھی۔ جنگِ صفین کے موقع پر بھی صلح ہو رہی تھی۔ حضرت معاویہؓ سمجھتے تھے کہ اگر میں ہتھیار ڈالتا ہوں تو مجھے حضرت علیؓ تک پہنچنے

ہی نہیں دیا جائے گا۔ فوراً میری گردن اڑا دی جائے گی۔ ورنہ حضرت معاویہؓ نے کبھی یہ نہیں کہا کہ مجھے علیؓ کی خلافت منظور نہیں اور نہ ہی انہوں نے کبھی خلافت کی بیعت لی۔ ان کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ پہلے ان سازشیوں سے اپنے آپ کو علیحدہ کیجئے۔ جن کے ہاتھ عثمانؓ کے خون سے رنگین ہیں انہیں اپنے اردگرد سے ہٹایئے۔ حضرت علیؓ یہ فرماتے تھے کہ میرے پاس طاقت نہیں۔ آپ میرا ساتھ دیں تو میں انہیں ہٹا دوں۔ یہ عقدہ لاینحل تھا جو حل نہ ہو سکا۔ یہ الجھن تھی جس پر قابو نہ پایا جا سکا۔ حضرت حسینؓ اور حضرت معاویہؓ کے حالات میں فرق صرف یہ تھا کہ کربلا میں حضرت حسینؓ کے ان ساتھیوں نے جنہوں نے خط لکھ لکھ کر انہیں بلایا تھا ان سے بے وفائی کی جبکہ جو لوگ حضرت علیؓ کے مقابلے میں حضرت معاویہؓ کے ساتھی تھے وہ آخر وقت تک ان کے وفادار رہے۔ ورنہ صورتحال وہاں بھی یہی ہوتی۔ حضرت معاویہؓ بھی اسی طرح شہید کر دیئے جاتے جس طرح حضرت حسینؓ شہید کر دیئے گئے اور اگر ان کے پاس بھی طاقت نہ ہوتی تو وہ کبھی ہتھیار نہ ڈالتے، سرنڈر نہ کرتے۔ ان حقائق کو سمجھئے اور اگر کہیں اختلاف ہو تو دلیل کا جواب دلیل سے دیجئے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ یہاں بہت سے دوستوں کے ذہن میں اُبھرنے والی ایک الجھن کو رفع کرنا بھی ضروری ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان حقائق کا بیان کرنا کیوں ضروری ہے! اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ غلبہ دین کی جدوجہد اور اسلامی انقلاب کی تیاری کے لئے لازم ہے کہ ہم اللہ کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین کے کردار پر جو بھی حملے کئے جاتے ہیں اُن کا دفاع کریں۔ کیونکہ اُن کا طرز عمل، اُن کا کردار ہماری ساری جدوجہد کے لئے دلیل و برہان اور نمونے کا درجہ رکھتا ہے۔ بالفاظِ قرآن۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ	محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ
مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ	اُن کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت
رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ	اور آپس میں رحیم ہیں۔ تم جب
رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ	دیکھو گے اُنہیں رکوع و سجود اور
فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا	اللہ کے فضل اور اُس کی خوشنودی
سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ	کی طلب میں مشغول پاؤ گے سجود

مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ط (سورۃ الفتح آیت ۲۹)

کے اثرات اُن کے چہروں پر موجود ہیں۔ جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔

جب تک یہ تاریکیاں چھانٹ نہ دی جائیں گی جب تک یہ مغالطے رفع نہ کئے جائیں گے اُس وقت تک لوگ دین کی جدوجہد کے لئے کھڑے نہیں ہوں گے۔ اُن کے سامنے تو یہ تصویر بھی پیش کی جارہی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جماعت تیار کی تھی اُس میں چند گنے چنے صاحب ایمان تھے۔ اکثر منافق تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو نہ منافق تھے نہ مومن۔ اللہ کے آخری رسولؐ کو تیئیس ۲۳ برس کی محنت کا یہ نتیجہ بتایا جارہا ہے۔ اُن کے تین خلفاء کو غاصب کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ایک دن کے لئے بھی صحیح اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی اور جب اُس وقت قائم نہیں ہوئی تو اب کہاں سے ہوجائے گی! معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ ان باتوں کو سُن کر کیسے کسی کے دل میں یہ جذبہ ابھر سکتا ہے کہ یہ کام دوبارہ ہو سکتا ہے۔ خدا کے رسولؐ کے کام کا جب یہ حشر ہوا تو آج کوئی کیا کر سکتا ہے۔ جب تک ان حقائق کو سامنے نہیں لایا جائے گا لوگوں کی غلط فہمیاں کیسے دور ہوں گی۔

موجودہ حالات میں ہمارا طریقِ کار

ہمارا یقین اور ایمان ہے کہ ایک دن اللہ کا دین پوری دُنیا پر غالب ہو کر رہے گا اور وہ وقت اب دور نہیں ہے۔ لیکن اس کے لئے جدوجہد کرنی پڑے گی وہ طریق کار سیکھنا پڑے گا اور اختیار کرنا پڑے گا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں نے اختیار کیا۔ امام مالکؒ کا قول میں آپ کو بارہا سنا چکا ہوں کہ "اس اُمت کے آخری حصے کی اصلاح بھی اُسی طرح ہوگی جس طرح اس کے پہلے حصے کی اصلاح ہوئی تھی"۔ ایک ادنیٰ اُمتی کی حیثیت سے میں نے بھی اُسی کام کا آغاز کیا ہے۔ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ میں بھی اُسی دین کی طرف بلا رہا ہوں۔ میری دعوت میں فرقہ واریت کا کوئی شائبہ بھی نہیں۔ میں نے کسی مسئلے کو ISSUE نہیں بنایا۔ آج تک نور و بشر کا مسئلہ نہیں چھیڑا۔ علم غیب کے مسئلے میں میں نے ہمیشہ یہی کہا کہ بات دونوں طرف کی صحیح ہے صرف تعبیر کا فرق ہے۔ میری ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ

میرا تشخص صرف مسلمان کی حیثیت سے نمایاں ہو۔کیوں کہ مجھے دعوت پیش کرنی ہے اقامتِ دین کی غلبۂ اسلام کی اور انقلابِ اسلامی کی ۔جس کا حکم قرآن میں دیا گیا ہے کہ

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ج وَاسْتَقِمْ
كَمَآ اُمِرْتَ ج وَلَا تَتَّبِعْ
اَهْوَآءَهُمْ ج وَقُلْ اٰمَنْتُ
بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ج
(سورۃ الشوریٰ آیت ۔۱۵)

پس (اے نبی) اسی (دین) کی طرف بلاؤ اور جس طرح کا بھی حکم دیا گیا ہے اُس پر مضبوطی سے قائم رہو اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو اور اُن سے کہہ دو کہ اللہ نے جو کتاب نازل کی ہے میں اُس پر ایمان لایا ۔

ہم کسی کے دباؤ میں آکر کسی کی خواہشات کی پیروی نہیں کریں گے ۔دلیل سے ہماری رائے بدلی جا سکتی ہے ۔ میں کبھی یہ نہیں کہتا کہ میری رائے میں غلطی کا امکان نہیں ۔کوئی دلیل سے میری غلطی واضح کر دے اسے تسلیم خم کروں گا ۔لیکن طاقت کی دلیل سے یہ گردن نہیں جھکے گی ۔ یہ گردن کٹ سکتی ہے ۔ طاقت کی دلیل سے جھک نہیں سکتی ۔

اے اہلِ لاہور! میں آج آپ سے پوچھتا ہوں کیا میں تیس برس سے آپکے سامنے کتابُ اللہ کا پیغام پیش نہیں کر رہا ہوں ۔میرا سارا کام میری ساری دعوت قرآن کے حوالے سے ہے ۔میں حدیث رسول کا منکر نہیں ہوں نہ اسکی اہمیت کو کم سمجھتا ہوں لیکن میں نے اپنا اصل موضوع اُسے نہیں بنایا اصل موضوع اللہ کی کتاب کو بنایا ہے۔ اس کتاب پر ایمان کا تقاضا ہے کہ ہم عدل کریں ۔جو بات کہیں اُس میں عدل ہو ۔

وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
مِنْ كِتٰبٍ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ
بَيْنَكُمْ ۔
(سُورۃ الشوریٰ آیت ۔۱۵)

اور اُن سے کہہ دو کہ ”اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے میں اُس پر ایمان لایا۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں ۔

ہمیں عدل کا حکم دیا گیا ہے ۔ اگر زیادتی کی گئی ہے تو اُس زیادتی کو زیادتی کہا جائے گا چاہے وہ آج کا کوئی فرعون کر رہا ہو یا آج کا کوئی ہامان کر رہا ہو۔ خواہ مذہبی فرقوں کی طرف سے زیادتی ہو رہی ہو یا سیاسی جماعتوں کی طرف سے زیادتی ہو رہی ہو تو ہم سچ کو سچ کہیں گے اور جھوٹ کو جھوٹ ۔ میں بھی آج اُسی طرح گزارش کر رہا ہوں

جیسے امام احمدؒ ابن حنبل نے فرمایا تھا "ایتونی بشئ من کتاب اللہ وسنۃ رسولہ حتی اقول" لاؤ میرے پاس کوئی دلیل اللہ کی کتاب سے یا اُس کے رسول کی سنت سے میں مان لوں گا۔ لیکن کتاب وسُنّت کی دلیل کے بغیر احمدؒ ابن حنبل ہرگز نہیں مانتے گا چاہے اس کی چمڑی ادھڑ جائے چاہے اُس کے جسم کے ٹکڑے اڑا دیئے جائیں۔ ہم بہت کمزور ہیں لیکن دل میں اُنہی کے نقشِ قدم پر چلنے کی آرزو ہے۔ اُنہی کے راستے کو ہم نے اپنا راستہ سمجھا ہے۔ یہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کا راستہ ہے۔ صحابہؓ کرام کا راستہ ہے۔ آئمہ اور محدثین کا راستہ ہے۔ ہمارے صلحاء اور صُوفیاء کا راستہ ہے۔ کیا امام ابوحنیفہؒ جیل میں نہیں ڈالے گئے؟ کیا امام مالکؒ کے کندھے نہیں اکھڑوا دیئے گئے؟ کیا احمدؒ سرہندی کو قید نہیں کیا گیا؟ کیا احمد ابن حنبل کو کوڑے نہیں پڑے؟ یہ سب کچھ ہوتا رہا ہے۔ یہ تو اس باغ کے پھول ہیں۔ یہ اس راہ کے سنگِ میل ہیں۔ یہ تو ہماری ہمتوں کو بڑھانے اور ہمارے ارادوں کو بلند کرنے والی مثالیں ہیں۔

آخری گذارش یہ ہے کہ گذشتہ دنوں میں مجھے بے حساب گالیاں دی گئیں۔ میرے بزرگوں کو گالیاں دی گئیں۔ میں واقعتاً آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ میری طرف سے کوئی جواب نہ دیجئے۔ اس طرح تو آپ میرے اجر و ثواب کو کم کر دیں گے۔ ان گالیوں سے اللہ تعالیٰ کے ہاں نہ معلوم میری اور میرے بزرگوں کی کتنی خطاؤں کا کفارہ ہو گیا ہے۔ البتہ ہر وقت دلیل سے سمجھنے اور سمجھانے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ قطعاً کسی سے لڑنے جھگڑنے کی ضرورت نہیں۔ امن و امان کو ہر صورت برقرار رکھیں۔ کہیں کوئی غلط اقدام نہ کیجئے۔ ہم تو اُس راستے پر چلنے کا عزم رکھتے ہیں جس پر چلتے ہوئے بارہ برس تک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب کو حکم تھا کہ تمہارے ساتھ کچھ بھی کیا جائے تم ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ ہم حضرت عثمانؓ کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہیں۔ ہم حضرتِ ہابیل کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہیں۔ حضرتِ حسینؓ کا اسوہ بھی ہمارے لئے اسوہ ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے اور ہو گا کہ ہمیں اپنے دفاع میں ہاتھ اٹھانا پڑے۔ لیکن موجودہ حالات کے حوالے سے میں قرآن کے الفاظ میں اعلان کر رہا ہوں کہ ان جھگڑوں کا فیصلہ تو اس احکم الحاکمین کی عدالت میں ہو گا آپ بہر صورت اپنے جذبات کو قابو میں رکھیں:

اَللّٰهُ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ لَنَآ اَعْمَالُنَا	اللہ ہی ہمارا رب بھی ہے اور تمہارا رب
وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا	بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں اور

وَبَيْنَكُمْ ؕ اللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ؕ	تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں۔ اللہ ایک روز ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کی طرف سب کو جانا ہے۔
(سورۃ الشوریٰ آیت : ۱۵)	

مجھے قتل کی جتنی دھمکیاں ملی ہیں اور میرے قتل کی جتنی افواہیں اڑی ہیں وہ آپ کے علم میں ہیں۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا کہ اگر ایسا ہو جائے تو اس سے بڑی سعادت کیا ہے۔ اگر کوئی فتنہ پرور سازشی میری ساری خطاؤں کا ذمہ لیتا ہے تو میرے لئے یہ گھاٹے کا سودا نہیں۔ اگر کسی ادنیٰ درجے میں بھی آخرت کا یقین ہے تو اس سے زیادہ نفع کا سودا اور کوئی نہیں۔ میں اس کے لئے تیار رہوں۔ ایسا ہو سکتا ہے لیکن پھر میری یہی گذارش ہے کہ اس پر کسی درجے میں کوئی اشتعال نہیں ہونا چاہیئے۔ زبان تک استعمال نہ کیجیے۔ جو ہوگا میرے ساتھ ہوگا۔ میرے لئے بڑی سعادت ہوگی۔ قرآن کا فرمان شہداء کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ :

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝	اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ نہ کہو۔ ایسے لوگ تو حقیقت میں زندہ ہیں مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا۔
(سورۃ البقرہ ، آیت : ۱۵۴)	

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آرزوئے شہادت کتنی اثر انگیز ہے

وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَوَدِدْتُ اَنِّيْ اُقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ اُحْيَا، ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْيَا، ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْيَا ثُمَّ اُقْتَلُ	قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ میری انتہائی آرزو ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں۔
(صحیح بخاری۔ کتاب الجہاد : باب ۷ تمنیٰ الشہادۃ)	

حضرت عمرؓ کی دعا کیا تھی۔ یہ بھی صحیح بخاری میں ہے۔ کتاب فضائل مدینہ (باب ۱۲) میں حضرت زیدؓ اور ام المؤمنین حضرت حفصہؓ کی روایت درج ہے کہ خلیفہ ثانی امیرالمؤمنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے رب سے عرض کیا کرتے تھے

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ شَھَادَۃً فِیْ سَبِیْلِکَ ، وَاجْعَلْ مَوْتِیْ فِیْ بَلَدِ رَسُوْلِکَ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وسلم (اے اللہ مجھے اپنے دین کی راہ میں شہادت عطا کر اور میری موت تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر میں ہو)

عمر فاروقؓ کی دعا کے آخری حصے کا پس منظر بھی سمجھ لیجیے۔ ایک مرحلے پر ایران کے جہاد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تو حضرت عمرؓ نے خود محاذِ جنگ پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس موقع پر حضرت علیؓ نے انہیں روکا۔ اس وقت حضرت عمرؓ کے دستِ راست حضرت علیؓ ہی تھے۔ حکومت کا پورا نظام، پورا سیکرٹریٹ حضرت علیؓ کے حوالے تھا۔ حضرت عمرؓ کا مشہور قول ہے کہ لَوْ لَا عَلِیٌّ لَھَلَکَ عُمَرُ: اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو گیا ہوتا۔ کیوں فرمائی حضرت عمرؓ نے یہ بات۔ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں حکومتِ اسلامیہ کی حدود اس تیزی سے پھیل رہی تھیں کہ اگر اس کی پشت پر وہ انتظامات نہ ہوتے جو حضرت علیؓ نے کیے تو تباہی ہو جاتی۔ حضرت علیؓ بہت اہم رکن تھے حضرت عمرؓ کی حکومت کے۔ حضرت عمرؓ کے سفرِ ایران کے ارادے پر حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ "چکی اسی وقت تک چلتی ہے جب تک اس کا دُھرا اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔ آپ کی حیثیت اس وقت اس امت کے اور عالمِ اسلام کے دُھرے کی سی ہے۔ آپ اپنی جگہ سے ہل گئے تو عالمِ اسلام کی چکی چلے گی کیسے! اس پس منظر میں دیکھیے کہ حضرت عمرؓ شہادت بھی مانگ رہے ہیں لیکن مدینۃ النبیؐ میں مانگ رہے ہیں۔ اور اللہ نے شہادت دے دی۔ تو کیا اس میں حضرت عمرؓ کا کوئی گھاٹا ہوا۔ انہیں تو زندگی کی تمنا ہی نہیں تھی۔ جس کا ایمان آخرت پر ہو وہ زندگی کی تمنا کبھی کر ہی نہیں سکتا۔ قرآن یہود سے یہی تو کہتا ہے اگر تمہیں خیال ہے کہ تم اللہ کے چہیتے ہو اور آخرت کا اجر تمہارے لیے محفوظ ہے تو موت کی تمنا کرو۔

قُلْ اِنْ کَانَتْ لَکُمُ الدَّارُ	ان سے کہو اگر واقعی اللہ کے نزدیک
الْاٰخِرَۃُ عِنْدَ اللّٰہِ خَالِصَۃً	آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر
مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا	صرف تمہارے لیے مخصوص ہے۔ تب
الْمَوْتَ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝	تو تمہیں چاہیے کہ موت کی تمنا کرو،
(سورۃ البقرہ آیت: ۹۴)	اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو۔

لہٰذا میرے لیے تو ان دھمکیوں میں نوید جانفزا ہے۔ لیکن ایک بات میں سمجھا دینا چاہتا ہوں ہر شخص کو ہر سازشی کو خواہ وہ کسی کا آلۂ کار ہو کسی اندرونی طاقت کا یا بیرونی قوت کا۔ ہر شخص جان لے کہ ڈاکٹر اسرار اب کسی فرد کا نام نہیں ہے، ایک فکر کا عنوان بن چکا ہے، ایک تحریک کی

علامت بن چکا ہے۔ وہ تحریک اقامت دین کی تحریک ہے، کوئی فرقہ دارانہ تحریک نہیں ہے۔ اسی دور کی مثال دیکھ لیجئے، شاہ ایران نے ڈاکٹر علی شریعتی کو قتل کروا دیا تو کیا ان کی فکر بھی ختم ہو گئی تھی۔ انقلاب ایران کو عظیم قیادت تو بہرحال خمینی صاحب کی صورت میں ملی لیکن اس کی پشت پر جو فکر تھا وہ ڈاکٹر علی شریعتی کا تھا۔ وہ اُن کی کتابیں تھیں اور ان کا فکر تھا جس نے لوگوں کے اندر آگ بھر دی تھی۔

فکر کبھی نہیں مرتا جو انقلابی فکر کتاب اللہ کے حوالے سے اس پاکستان میں گزشتہ تیس برس سے پھیل رہا ہے اور آج لاکھوں کیسٹوں کی صورت میں ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے وہ انشاء اللہ اپنے نتائج ظاہر کرے گا۔ وہ میرا فکر نہیں ہے وہ اللہ کی کتاب کا پیغام ہے۔ اللہ کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کا پیغام ہے۔ آپ سے صرف اتنی گذارش ہے کہ ہر شخص اپنے فرض کو پہچانے اس فکر کو پھیلائے۔ اقامتِ دین کی تیاری کرے۔ اپنی توانائیوں کو دوسری باتوں میں ضائع کرنے کی بجائے ہمیں اپنا پورا وقت اور پوری صلاحیتیں قرآن کی اس دعوت کو پھیلانے پر صرف کرنی ہیں اور ایک ایسی جمعیّت تیار کرنی ہے جو اس قرآن کے انقلاب کے لئے تن من دھن لگانے کے لئے تیار ہو۔ ہمیں اپنے اسی مثبت کام سے کام رکھنا ہے۔ ان وقتی خرخشوں اور جھگڑوں کی طرف متوجّہ ہونے کا مطلب تو یہ ہے کہ ہم نے اغیار کی سازشوں کو خود برگ و بار لانے کا موقع دے دیا ہے۔ أقول قولی ھٰذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المومنین والمومنات

سرِدست ایک سالانہ خریداری

میں ماہنامہ "میثاق" لاہور کا سالانہ خریدار بننا چاہتا ہوں / چاہتی ہوں براہ مہربانی مجھے ماہ ــــــ کا شمارہ -/۴۴ روپے کی وی پی کی شکل میں درج ذیل پتے پر ارسال کر دیجئے / میری طرف سے سالانہ زرتعاون کی رقم بذریعہ منی آرڈر / بنک ڈرافٹ ارسالِ خدمت ہے۔

نام ------------------------

پتہ ------------------------

نوٹ: رقم ماہنامہ میثاق ۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور کے پتے پر ارسال کی جائے

Coca-Cola
Coca-Cola is it!
TRADE-MARK REGD.
"COCA-COLA" AND "COKE" ARE THE REGISTERED TRADE-MARKS WHICH IDENTIFY
THE SAME PRODUCT OF THE COCA-COLA COMPANY.

اُمِّ حکیم بنتُ الحارث
رضی اللہ عنہا

تحریر: عائدۃ مہاجر ○ ترجمہ: ابوعبدالرحمٰن شبیر احمد بن نور احمد

اُمِّ حکیم رضی اللہ عنہا کا مثالی کردار اس بات کی واضح شہادت ہے کہ اسلام نے اہلِ ایمان کے اندر ایک حقیقی تبدیلی کی طرح ڈالی ہے خواہ اسلام قبول کرنے والے مرد ہوں یا عورتیں۔

اُمِّ حکیم بنت الحارث بن ہشّام المخزومی کے حالات کا جائزہ لیں تو مندرجہ ذیل حقائق ہمارے سامنے آتے ہیں:

والد کا نام الحارث بن ہشّام بن المغیرۃ المخزومی ہے۔ قریش کے سردار اور سیاسی لیڈر، نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم ان کے قبولِ اسلام کے بھی اسی قدر خواہش مند تھے جس طرح آپ کی خواہش تھی کہ ان کا بھائی الحکم بن ہشّام (ابوجہل) اسلام قبول کرے، اللہ تعالیٰ نے الحارث بن ہشّام کو اسلام کی توفیق بخشی، کیونکہ وہ نیک طینت اور سلیم الفطرت تھے، نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشادِ گرامی ہے:

"الحارث خود بھی سردار ہے اور ان کا والد بھی سردار قوم تھا، میری دلی خواہش ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اسلام قبول کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔"

اُمِّ حکیم کی والدہ کا نام فاطمہ بنت الولید بن المغیرہ ہے۔ یہ حضرت خالد بن الولید کی ہمشیرہ ہیں (واضح رہے کہ حضرت خالد بن الولید کا لقب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے سیف اللہ المسلول تجویز فرمایا تھا)۔ اُمِّ حکیم اپنے خاوند حضرت عکرمہ بن ابی جہل کے ساتھ ہی فتح مکّہ کے موقع پر ایمان لائی تھیں

اُمِّ حکیم کے خاوند کا نام عکرمہ بن ابی جہل ہے۔ یہ قریش کے سرکردہ لیڈروں میں سے تھا۔ فتح مکّہ کے دن یمن کی طرف بھاگ نکلا تھا۔ اُمِّ حکیم کی خواہش تھی کہ عکرمہ اسلام کی نعمت سے محروم نہ رہے۔ لہٰذا اس نے اپنے خاوند کی خاطر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں سفارش کی، آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اُمِّ حکیم کی سفارش قبول فرمائی۔ چنانچہ وہ دوڑی دوڑی ساحلِ جدّہ پر

اپنے خاوند کے پاس گئی اور اسلام کے بارے میں مطمئن کیا۔ تب مکرمہ واپس مکہ مکرمہ پہنچا، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عکرمہ کا ان الفاظ سے استقبال کیا۔

"چھوڑ کر جانے والے کو خوش آمدید"

اس پُرخلوص جملے نے عکرمہ کا دل مطمئن کر دیا اور وہ حلقۂ اسلام میں داخل ہوگیا۔ اس خاندان کو شدید احساس لاحق ہوا کہ وہ نیکی اور بھلائی میں دوسروں سے بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے پختہ عزم کرلیا کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعے اس کمی کی تلافی کریں گے۔ یہ سارے کے سارے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے دورِ خلافت میں حدود شام پر جہاد میں پیش پیش رہے ——— ایک ایک فرد نے اپنی ندامت کا اظہار کیا کیونکہ وہ اسلام قبول کرنے میں دوسروں سے پیچھے رہ گئے تھے۔ الحارث بن ہشام نے ان الفاظ میں اپنی حسرت کا اظہار کیا:

"یہ جہاد کے لئے نکلنا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سفر کرنا ہے۔ میں تمہارے مقابلے میں کسی دوسرے کو ترجیح نہیں دوں گا۔ یہ جہاد کا کام تو ایک وقت سے جاری ہے قریش کے دیگر نوجوان تو عرصے سے اس میں شریک ہیں۔ قسم بخدا اگر مکے کے پہاڑ سونا ہو جائیں اور ہم انہیں راہِ خدا میں خرچ کر ڈالیں، تب بھی ہم ان کے ایک دن کی نیکیوں کو نہیں پہنچ سکتے۔ اگر یہ لوگ دنیا میں پہل کر کے آگے نکل گئے ہیں تو ہماری انتہائی کوشش ہوگی کہ آخرت میں نیکیوں کے اعتبار سے ان کے قریب قریب پہنچ جائیں"۔

حضرت ام حکیم رضی اللہ عنہا کے خاوند حضرت عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہ نے اپنے ایمان کی سچائی اور گذشتہ زندگی میں ہونے والی کوتاہی پر اظہار افسوس و شرمندگی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ان الفاظ سے کیا۔

"اللہ کی قسم! جس قدر دولت میں اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکنے کے لئے خرچ کرتا تھا اب میں اس سے دوگنا اللہ کی راہ میں خرچ کروں گا۔ اور جس قدر میں باطل کی خاطر لڑا تھا اس سے دوگنا اللہ کی راہ میں لڑوں گا اور اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ کی ذات گرامی کو اس عہد پر گواہ بنا رہا ہوں"۔

غزوۂ یرموک کے موقع پر ام حکیم کے والد حضرت الحارث رضی اللہ عنہ بن ہشام اور خاوند حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ بن ابی جہل حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں لڑتے لڑتے شہید ہوئے۔ اور ان دونوں

کا کردار اس جنگ میں ایسا مثالی تھا جو ہر مسلمان کے لئے آج تک مشعلِ راہ ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

حضرت حارث، عکرمہ اور سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہم شدید زخمی ہو گئے۔ پانی لایا گیا جبکہ یہ سب حضرات موت کے منہ تک پہنچ چکے ہیں۔ ہر ایک نے ایثار و قربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پانی دوسرے کی طرف بھیجدیا اور جس کے پاس بھی پانی پہنچا اس نے دوسرے کو پلانے کی سفارش کی۔ اس ایثار و قربانی کے عالم میں وہ اپنے رب کے ہاں پہنچ گئے اور کوئی بھی پانی نہ پی سکا

والد اور خاوند کی شہادت کے بعد بھی ام حکیمؓ پر کوئی مایوسی طاری نہیں ہوئی بلکہ پوری ثابت قدمی کے ساتھ جہاد میں شریک ۔ اتنے بڑے اندوہناک سانحہ پر بھی صبر کا مظاہرہ کیا اور اللہ کی رضا کی خاطر قطعاً جزع فزع نہیں کی

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو یہ بات گوارا نہ تھی کہ حضرت ام حکیم کو اس طرح بے خاوند چھوڑ دیں، خاص طور پر جب کہ کوئی محرم رشتہ دار بھی ہمراہ نہیں ہے۔ کئی ایک صحابہ نے پیغام نکاح بھیجا جن میں سے یزید بن ابی سفیان اور خالد بن سعید بن العاص خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ام حکیم نے خالد بن سعید سے رشتہ داری قبول کر لی۔ حضرت خالد بن سعید ابتدائی دور میں اسلام لانے والوں میں سے ہیں۔ وہ حضرت ابوبکرؓ کے بعد اسلام لائے۔ عدت مکمل ہونے کے بعد حضرت خالد نے نکاح کر لیا۔ اس وقت اسلامی لشکر "مرج الصفر" کے مقام تک پہنچ چکا تھا۔ حضرت خالد نے جلد رخصتی کا اظہار کیا، حضرت ام حکیم نے کہا، اس لشکر کے چھٹ جانے کے بعد ایسا کر لیں، حضرت خالد نے کہا میرا دل کہتا ہے کہ میں اس جگہ شہید ہو جاؤں گا۔ تو حضرت ام حکیم نے کہا تو پھر ٹھیک ہے۔ حضرت خالد نے صفر والے پل کے پاس شب زفاف منائی اور یہیں ولیمہ کیا۔ اس مناسبت سے اس جگہ کا نام "ام حکیم پل" رکھ دیا گیا۔

شادی کی یہ ایک نرالی شکل ہے۔ لیکن سلف صالحین کے نکاح اسی طرح سادگی سے ہو جاتے تھے۔ اگر آج کے دور میں کوئی مسلمان خاتون ایسا کرلے تو اسے "بے وفائی" کا الزام دیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے تو انداز فکر ہی بدل دیا ہے اور ذہنوں کو ایک نئے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ دل و دماغ کا معیار سوچ بدل کر رکھ دیا ہے۔ چنانچہ ہمیں

اپنے رواجات کے مطابق اسلام کو نہیں ماپنا اور پرکھنا چاہیئے۔

——— صبح ہوتے ہی رومیوں نے اپنی صفیں سیدھی کرلیں اور دور دور تک ان کی فوجیں موجیں مار رہی تھیں، حضرت خالد بن سعید (ام حکیم کے دوسرے اور نئے خاوند) مقابلے کے لئے نکلے، لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ دوران جنگ اس المناک حادثے سے بھی ام حکیم بالکل نہیں گھبرائیں، اپنے خاوند کی شہادت کے غم کے بدلے اللہ سے اجر کی امید نے انہیں اور جری اور بہادر کر دیا، اپنے کپڑوں کو اچھی طرح کس کے خود جنگ میں کود پڑیں۔ نئی نئی شادی کی زینت بھی ابھی باقی تھی اسے اتارنے کا انہیں موقع بھی نہ مل سکا۔ جو تعلق صرف ایک رات کے لئے قائم ہوا تھا۔ ام حکیم نے اپنے خیمے کا کھونٹا ہاتھ میں لے کر اس قدر دشمنان خدا سے جنگ کی کہ سات رومیوں کو جہنم کے گھاٹ اتار دیا۔ اس طرح انہوں نے اس بات کا مثالی نمونہ پیش کیا کہ ذاتی محبت کے مقابلے میں اللہ کی رضا مؤمن کے دل پر کسطرح غالب رہتی ہے۔

ام حکیم نے اپنے کردار سے یہ بات بھی واضح کر دی کہ حقیقی خوشی اسی دن حاصل ہوگی جس دن اسلام غالب ہو جائے اور حقیقی غم اس دن ہوتا ہے جس دن اسلام کا جھنڈا سرنگوں ہو جائے، ذاتی حالات کا اثر لئے بغیر جوش ایمان اس وقت تک ٹھنڈا نہیں ہوتا جب تک اسلام کے جھنڈے کو لہلہاتے نہ دیکھ لیا جائے۔ اہل ایمان کو سچی خوشی تو اللہ کی مدد کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔

میں نہیں جانتا کہ ہمارے دور کی عورتیں اپنے جذبات پر اس قدر قابو رکھ سکتی ہیں کہ نہیں؟ جیسا کہ ام حکیم نے عملاً کر دکھایا۔ رضی اللہ عنہا وعن جمیع الصحابۃ ——

(ماخوذ از مجلہ "الجہاد" پشاور شمارہ ۲۰ ۱۹۸۶ء)

حُسنِ انتخاب

فریاد ہے فریاد

ارتضیٰ حیدر

ارتضیٰ حیدر صاحب نو میائے گئے بنکوں میں سے ایک کے تربیتی شعبے سے منسلک ہیں۔ درمیانی عمر کے تعلیم یافتہ جوان ہیں اور معروف معنوں میں اہلِ قلم شمار نہیں ہوتے بلکہ انہیں خود بھی دانشوروں کی صف میں کھڑا ہونے کا شوق لاحق نہیں۔ اُن کی غیر روائتی تقطیع لیکن خوبصورت کتابت میں عمدہ کاغذ پر شائع شدہ یہ پمفلٹ نما کتاب فی الاصل ایک حسّاس اور حبِّ وطن سے سرشار پاکستانی کے ذہنی وقلبی اضطراب کی لہروں سے اُبھرنے والی فریاد ہے جس میں وہ گرد و پیش کے ماحول کی خوفناک حد تک آلودگی پر واویلا کر کے بساط بھر یہ کوشش بھی کرتا ہے کہ لوگ تطہیر کی کوششوں کی طرف مائل ہوں۔ اُن کی طرح کے سب ہی لوگ کم و بیش ایسی ہی باتیں سوچ رہے ہیں۔ لیکن اس سوچ میں نکھار اور تجویز میں پختگی تبھی پیدا ہو سکتی ہے جب محرکاتِ قیامِ پاکستان، تقسیم کے بعد کی صورتِ حال اور نقضِ عہد کے باعث پیدا شدہ بے مقصدی اور ابتری کا صحیح تناظر میں تجزیہ کیا جائے۔ بے جا نہ ہوگا اگر اس سیاق و سباق میں ہم امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی حالیہ تصنیف "استحکامِ پاکستان" کا ذکر کریں۔ اس میں بھی کہا گیا ہے کہ:

"چنانچہ یہ اسی کا مظہر ہے کہ ہم قومی و ملّی سطح پر اخلاق کا دیوالہ نکل جانے کی کیفیت (MORAL CRISIS) سے دوچار ہیں۔ آٹے میں نمک کی حیثیت کے حامل افراد کو علیحدہ رکھتے ہوئے واقعہ یہ ہے کہ قومی اور اجتماعی سطح پر صداقت و امانت اور شرافت و مروّت کا جنازہ نکل چکا ہے اور ایفائے عہد اور پاسِ امانت کا دُور دُور تک نشان نہیں ملتا۔ انفرادی اعتبار سے خالص خود غرضی اور

عُریاں مفاد پرستی کا دور دورہ ہے۔ اور قومی مصالح اور ملّی مفادات سے کسی کو کوئی غرض نہیں رہی، معاملات میں بدعہدی اور بددیانتی بلکہ باضابطہ مکّاری اور چالبازی کی گرم بازاری ہے تجارت اور لین دین میں دھوکے اور فریب سے بھی بڑھ کر کھانے پینے کی چیزوں حتیٰ کہ ادویات تک میں ملاوٹ گویا معمول بات بن کر رہ گئی ہے۔ سرکاری محکموں اور دفتروں میں رشوت ستانی کا بازار تو گرم ہے ہی باضابطہ اذیت رسانی اور لوگوں کی عزتِ نفس کو مجروح کرنا تفریح اور مشغلے کی صورت اختیار کر گئے ہیں اور معاشرتی اور سماجی سطح پر سنگدلی اور سفاکی نے ڈیرے جما لیے ہیں تو سیاسی و حکومتی سطح پر بھی جھوٹ اور وعدہ خلافی نے 'ORDER OF THE DAY' کی صورت اختیار کر لی ہے اور ہر سوچنے سمجھنے والا اور حساس شخص حیران و پریشان ہے کہ ؎

یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین ۔۔۔ پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ!"

گویا ڈاکٹر صاحب موصوف کی فریاد کی لَے بھی ارتضیٰ حیدر صاحب کی فریاد سے ملتی ہوئی اُٹھتی ہے۔ فرق بہرحال یہ ہے کہ "استحکامِ پاکستان" اس فریاد کا پاکستان کی اساس اور ہمارے دین کے فلسفۂ عروج و زوال کے پس منظر میں منطقی تجزیہ کر کے تلافی کی تجویز بھی نہایت محکم انداز میں دینِ مبین کے مہیا کردہ خطوط پر کرتی ہے جس کا نسخۂ شافی مع پرچۂ ترکیب استعمال ڈاکٹر صاحب کی آئندہ کتاب "پاکستان میں اسلامی انقلاب: کیا، کیوں اور کیسے!" میں آرہا ہے۔ جبکہ ارتضیٰ حیدر صاحب کا فکر تا حال اتنا پختہ نہیں ؎

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی ۔۔۔ اپنے سینے میں اِسے اور ذرا تھام ابھی

تاہم مصنف کی فریاد ہمارے دل کو ایسی لگی کہ اُن کی اجازت سے اُسے من و عن بالاقساط 'میثاق' میں شائع کرنے کا ارادہ ہے ؎

گر تن نہیں زباں سہی آزاد کچھ تو ہو ۔۔۔ دُشنام، نالہ، ہاؤ ہو، فریاد کچھ تو ہو

ہماری خواہش ہے کہ "میثاق" کی تنگیٔ داماں اس خواہش میں حائل نہ ہو — فریاد کے مشمولات کے بارے میں صرف ایک بات کا ذکر ہم ضروری سمجھتے ہیں۔ مصنف نے پورے خلوص سے جہاں ملک و ملت کی تعمیر میں خواتین کے حصے کی بات کی ہے وہاں اُن کا قلم ہمارے نقطۂ نظر سے ذرا بہک گیا ہے۔ ہم اُن سے اس حد تک تو متفق ہیں کہ قوم کی کم و بیش نصف آبادی کو ترقی کے لیے تگ و دو سے علیحدہ نہیں رکھا جانا چاہیئے۔ لیکن یہ وضاحت ضرور کریں گے کہ طبقۂ نسواں اپنی کارکردگی دین کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے بھی پوری طرح دکھا سکتا ہے اور کہ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے اپنے مَردوں کو گھروں میں ویسا سکون اور اطمینان مہیا کرے جو قوموں کی تعمیر میں مطلوب و مضبوط مسالے کا کام دیتا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اگلی نسل کی تعلیم و تربیت پر اس دقتِ نظر سے توجہ دے کہ مستقبل زیادہ اور واقعتہً تابناک ہو۔

(اقتدار احمد)

اقتصادی کردار

ایک محب وطن پاکستانی ہونے کی حیثیت سے یقیناً آپ کے علم میں ہوگا کہ

۱۔ پاکستان ۱۰بلین ڈالر کا مقروض ہے۔
۲۔ گذشتہ ۳۸ سالوں میں ہمیں ۳۶ سال غیر ملکی تجارت میں خسارہ ہوا اور صرف دو سال فائدہ ہوا۔ ایک بار (۵۲-۱۹۵۱) کوریا کی جنگ کی وجہ سے اور دوسری دفعہ (۷۲-۱۹۷۱) کرنسی کی قیمت (۱۳۰ فیصد) میں ریکارڈ کمی کی وجہ سے۔ اب غیر ملکی تجارت میں یہ خسارہ سال بر سال بڑھتا جا رہا ہے۔ جو اب ۵۴ ارب روپے ہے۔
۳۔ اس خسارے غیر ملکی قرضوں اور ان پر سود کی ادائیگی کے لیے ہمیں مزید قرض لینا پڑتا ہے۔ یوں ہر سال قرض تیزی سے بڑھ رہا ہے اور آنیوالی نسلوں کو ہم ایک مقروض و بھکاری قوم کی حیثیت سے تیار کر رہے ہیں۔
۴۔ بیروزگاری کی شرح روز بروز بڑھ رہی ہے اور اب تو تعلیم یافتہ لوگ بھی روزگار کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔
۵۔ ملکی معیشت کا استحکام اور کامیاب اقتصادی پالیسیوں کا ردعمل کرنسی پر ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے گذشتہ ۱۵ سال سے ہماری کرنسی کی قیمت تیزی سے کم ہو رہی ہے۔ ۱۹۷۰ء میں ۴٫۶۰ روپے کے مقابلے میں آج ڈالر -/۱۶ (سولہ) روپے کے برابر ہے۔

ایک سنجیدہ، ذی شعور اور محب وطن پاکستانی کے لیے یہ حقائق باعث تشویش اور کرب و اذیت بھی ہیں۔ ان

مسائل کا حل کیا ہے؟

کوئی شخص ملکی باشندہ ہو یا غیر ملکی ہمارے شاہانہ طرز زندگی اور تعیش پرستانہ معاشرت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہمارے ٹھاٹھ باٹھ کا اندازہ ہمارے بازاروں میں موجود اشیائے تعیش کی کثرت سے لگایا جا سکتا ہے۔ بڑے بڑے شہروں کے بازار اور دکانیں غیر ملکی ساز و سامان سے بھری پڑی ہیں۔ کوئی چیز قانونی طور پر درآمد کرنے کی اجازت نہیں تو اُسے ہم گفٹ سکیم کے ذریعے باآسانی باہر سے منگا سکتے ہیں۔ اب تو لنڈی کوتل اور باڑے جانے کی ضرورت نہیں ہمارا ہر بازار اور سٹور لنڈی کوتل / باڑہ بن چکا ہے اس کے علاوہ DUTY FREE SHOPS کی سہولتیں بھی میسر ہیں۔ ان تمام ذرائع سے غیر ملکی ساختہ ہر شے دستیاب ہے اگر کسی خریدار نے غلطی سے کہہ دیا کہ یہ تو پاکستانی چیز ہے تو دکاندار غصے اور اعتماد سے کہے گا کہ ہمارے یہاں تمام کی تمام اشیا غیر ملکی ہیں وہ اس طرح صفائی پیش کرے گا اور جواب دے گا جیسے خریدار نے بہت بڑا الزام لگا دیا ہو۔ پاکستانی مصنوعات پر غیر ملکی مہریں لگا کر فروخت کی جاتی ہیں اور ہم دیوانوں کی طرح انہیں گراں قیمتوں پر خریدتے ہیں۔ سڑکوں پر موٹر کاروں کی فراوانی دیکھ کر پاکستانی تو کیا غیر ملکی لوگ بھی حیران رہ جاتے ہیں۔ بہترین اور گراں قدر کاریں آپ کو نظر آئیں گی۔ غیر ملکی سامان جس میں رنگین ٹیلیویژن، وی سی آر، ٹیپ ریکارڈر، ریفریجریٹرز، ڈیپ فریزر، کپڑے دھونے کی مشینیں ہر طرح کا کپڑا، ریڈی میڈ ملبوسات آرائش و زیبائش کا سامان، کراکری، جوتے، بچوں کے کھلونے غرضیکہ چھوٹی و بڑی سستی و مہنگی ہر شے غیر ملکی نظر آئے گی۔ اس کے

غیر ملکی اشیاء کا استعمال قوم سے اقتصادی غداری ہے

علاوہ ہر سال نئے ماڈل کی خریداری بھی ضروری ہے کیونکہ پرانا ماڈل غربت کی نشاندہی کرتا ہے۔

اب ایک اور دھندا شروع ہو گیا ہے کچھ لوگ بانگ کانگ، سنگاپور، بنکاک اور دوسرے ممالک سے پتلون، شرٹ، ٹائی، جرابیں، جوتے، کولون، گاؤن، فلموں کے کیسٹ، فلمی رسائل وغیرہ کے بکس بھر کر لے آتے ہیں اور یہاں انہیں مختلف دکانوں پر مہنگے داموں فروخت کر دیتے ہیں۔ یہ کاروبار بہت چمک رہا ہے۔ کسٹم والوں سے جان پہچان نکل آئے تو وی سی آر وغیرہ بھی لے آتے ہیں۔ ہندوستانی فلموں کا کاروبار تو اپنے عروج پر ہے۔ برطانیہ اور امریکہ وغیرہ کی وہ فلمیں جن کی درآمد پر پابندی ہے۔ آپ کو کھلے بندوں مل سکتی ہیں۔ بھارت کے بہت سے رسائل خصوصاً فلمی جن میں سٹار ڈسٹ قابل ذکر ہے جس کی قیمت ہندوستان میں صرف ۵ روپے ہے۔ پاکستان میں ۴۵ روپے میں ملتا ہے۔ اس کے شوقین اس قدر دو قیمت پر بھی حاصل کرتے ہیں۔ مگر حکومت کی پابندی کے باوجود یہ باآسانی مل جاتے ہیں۔ ان فلموں و رسائل کے شائقین کو ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے نام اور ان کا شجرہ نسب تک یاد ہوتا ہے۔ ان کے لباسوں کے ڈیزائن یہاں کے مقبول فیشن بن جاتے ہیں۔

غیر ملکی مصنوعات کا استعمال احساس کمتری، ذہنی غلامی اور ملک دشمنی کا مضبوط ثبوت ہے

جوان نسل کے لڑکے تعلیم ادھوری چھوڑ کر وی سی آر کی فلموں اور ریکارڈنگ کی دکانیں کھول لیتے ہیں۔ ایسی دکانیں آپ کو ہر بازار میں ملیں گی۔

اس گھر کو معاشرے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جس گھر میں زیادہ سے زیادہ غیر ملکی سامان ہو اور لوگ بھی فخر سے بتاتے ہیں کہ ہمارے گھر میں تمام کی تمام

اشیاء غیر ملکی ہیں۔

ایک ایگزیکٹو کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ اُن کا LAWN ہمیں بہت پسند آیا اور تعریف کر دی تو وہ برملا کہنے لگے: بے وقوف! اس گھر کو اندر سے دیکھ تمہاری عقل دنگ رہ جائے گی۔ ہر چیز باہر سے لے کر آیا ہوں۔ فرنیچر تک غیر ملکی ہے۔

اگر آپ اپنے اردگرد کے ماحول کا بغور مطالعہ کریں تو شادی میں بھی کپڑے سے لے کر جیولری تک تمام کی تمام اشیاء باہر سے منگوائی جاتی ہیں اور جس جہیز میں پاکستانی اشیاء ہوں اس جہیز کو شایانِ شان نہیں سمجھا جاتا۔

یہ تو سامانِ تعیش ہے دوسری طرف ہمیں صنعتی ترقی کے لیے مشینری و خام مال کی ضرورت ہے۔ غیر ملکی ترقی یافتہ ٹیکنالوجی بھی ہمیں چاہیے جس سے صنعتی ترقی میں مدد ملتی ہے۔ اس میں بسا اوقات وہ مشینری بھی بیرون ملک سے منگوائی جاتی ہے جو پاکستان میں بن رہی ہوتی ہے اور یقیناً غیر ملکی مشینری سے بہتر ہوتی ہے۔ اس صورت میں غیر ملکی مشینری کی درآمد بھی سامانِ تعیش میں شمار ہوگی۔

اس کے علاوہ جب ہم بین الاقوامی فنڈ اور دوسرے مالیاتی اداروں سے قرضہ لیتے ہیں اس میں آزاد معیشت بالخصوص درآمدی تجارت پر کم سے کم پابندی لگانے پر

غیر ملکی مصنوعات و اشیاء کا استعمال

غیر ممالک سے محبت اور اُن کی

معاشی ترقی میں حصہ لینا ہے

زور دیا جاتا ہے۔ ہم ایسی شرائط کو کسی حیل و حجت کے بغیر مان لیتے ہیں اس طرح ہمیں قرضے آسانی سے مل جاتے ہیں اور ہمارے افسران اور حکام بالا ان قرضوں کو بہتر معاشی کارکردگی اور مالیاتی منڈیوں میں بہتر ساکھ اور اپنے مالیاتی انتظام کی کامیابی تصور کرتے ہیں۔ آزاد تجارت کے علاوہ دوسری شرائط بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً ادارے کے تجویز کنندہ ممالک سے مشینری و خام مال درآمد کریں گے۔ یہ مشینری و خام مال کھلی مارکیٹ کے مقابلے میں گراں قیمت و کم معیار کا ہوتا ہے۔ پھر ان ممالک کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ مہنگے ممالک سے ماہرین بھی منگوائیں۔ یہ ماہرین باصلاحیت نہیں ہوتے اور اکثر و بیشتر اپنے ممالک میں بے روزگار یا بہت کم تنخواہ پر ملازم ہوتے ہیں اور یہاں یہ گراں قدر مراعات پر آتے ہیں۔ سوڈان اور بھارت نے بین الاقوامی مالیاتی فنڈ سے

بیرونی ممالک میں سرمایہ رکھنے والے

اور وہاں اثاثے خریدنے والے پاکستان

کے غدار اور قوم کے سب سے بڑے دشمن ہیں

قرض محض اس لیے نہیں لیا کہ انہیں مالیاتی فنڈ کی شرائط منظور نہیں تھیں۔ بھارت کو ۵ بلین ڈالر کا قرضہ منظور ہوا مگر بھارتی حکمرانوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

یہ نام نہاد مہذب اور ترقی یافتہ ممالک ان مالیاتی اداروں کے ذریعے مختلف حیلوں بہانوں سے ہماری صنعت کو پھلنے پھولنے سے روکتے ہیں۔ یہی ممالک تیسری دنیا کے غریب ممالک کی غربت و معاشی بدحالی کے ذمہ دار ہیں۔ بین الاقوامی مالیاتی اداروں پر انہی کا کنٹرول ہے۔ ان اداروں کی پالیسیاں بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود یا تیسری دنیا کے غریب ممالک کی ترقی کے لیے نہیں بلکہ ان ترقی یافتہ ممالک کو لوٹ کھسوٹ میں آسانیاں فراہم کرنے کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ یہ ترقی یافتہ و مہذب ممالک بعض اوقات براہ راست بھی ہماری صنعتی پیش رفت میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں۔

"GULF ECONOMIST" کی ایک رپورٹ کے مطابق

جاپان ۱۹۷۴ء میں ایک مشینری پاکستان میں ۲۴ ہزار ڈالر کی بیچ رہا تھا جب یہ مشینری پاکستان میں بننا شروع ہوئی تو پاکستان کی صنعت کو نقصان پہنچانے کے لیے جاپان نے ۷۹-۱۹۷۸ء میں یہی مشینری پندرہ ہزار ڈالر میں فروخت کرنا شروع کر دی حالانکہ ۱۹۷۴ء کے مقابلہ میں ۷۹-۱۹۷۸ء میں

آپ کے غیر ملکی اشیاء کے استعمال نے پاکستانیوں کو بھکاری، مقروض، بے بس، کمزور، بیروزگار قوم بنا دیا ہے

قیمتیں بہت بڑھ گئی تھیں۔ یقیناً ۷۹-۱۹۷۸ء میں مشینری پندرہ ہزار ڈالر کی بیچ کر بھی جاپانی منافع کمائے ہوں گے تو اب آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ۱۹۷۴ء میں جب وہ ۲۴ ہزار ڈالر میں فروخت کر رہے تھے اس وقت کتنا زبردست منافع کما رہے تھے۔ بعض دیگر مثالوں سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ ترقی یافتہ قومیں تیسری دُنیا کے غریب ممالک کی ترقی میں جہاں تک ممکن ہو سکتے مشکلات کھڑی کرتی ہیں۔

یہ قومیں ترقی کے نام پر اربوں ڈالر ایٹمی ہتھیار بنانے پر اور چاند ستاروں کو فتح کرنے کے لیے خرچ کر رہی ہیں۔ ان کو افریقہ کے قحط زدہ کروڑوں اور بنگلہ دیش کے سیلاب زدہ لاکھوں بے گھر انسانوں کی کوئی فکر نہیں۔ انہی کی اقتصادی لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے آج تیسری دنیا کے تمام ممالک کھربوں ڈالر کے مقروض ہیں۔ یہی ترقی یافتہ قومیں چھوٹے چھوٹے ممالک کو آپس میں لڑا کر خوب اسلحہ بیچ رہی ہیں اور جب تک ان کا اسلحہ بکتا رہے گا یہ اپنی اقتصادی ترقی کی مطلوبہ رفتار برقرار رکھ سکیں گی۔ اس وقت ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ان ظالموں کے شکنجوں سے نکلنا ہے۔

غیر ملکی مصنوعات کی کثرت خریداری سے بیرونی تجارت میں سالانہ خسارہ تین بلین ڈالر کو پہنچ چکا ہے۔ اب اس خسارے کو پورا کرنے کے لیے اور گذشتہ سالوں کے تجارتی خساروں و قرضوں اور ان پر سود در سود ادا کرنے کے لیے ہمیں مزید قرض حاصل کرنا ہوتا ہے اس طرح ہم مسلسل خسارے کی وجہ سے قرض در قرض میں جکڑے گئے ہیں۔

پاکستان کو بڑے بڑے منصوبوں مثلاً ترجیلا ڈیم، اسٹیل مل وغیرہ کی تکمیل کے لیے اور دفاعی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے قرض کا حصول ناگزیر ہے مگر سامانِ تعیش کی درآمد بند کر کے خسارے کے بوجھ کو ہلکا کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان سے سرمایہ منتقل کرنیوالے اور غیر ممالک میں زرِ مبادلہ خرچ کرنے والے قوم کے اقتصادی غدار ہیں

کسی ملک کے معاشی استحکام اور اُس کی اقتصادی قوت و حالت کا اندازہ اُس کی کرنسی کی مارکیٹ قیمت سے لگایا جا سکتا ہے ہمارے ملک میں غیر ملکی اشیاء کی بھرمار ہے اور ان کی ادائیگی اس تناسب سے غیر ملکی کرنسی میں ہی ہوتی ہے اس غیر ملکی کرنسی کو پہلے خریدا جاتا ہے چونکہ ہماری ۷۰ فیصد ادائیگیاں ڈالر کے ذریعے ہوتی ہیں اس لیے ہم ڈالر خریدتے ہیں۔ چونکہ ڈالر کی مانگ دنیا میں بہت زیادہ ہے۔ اس لیے اُس کی قیمت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ دوسرے الفاظ میں پاکستانی روپے کی قیمت گر رہی ہے جس کے نتیجے میں وہ ڈالر جو ۱۹۷۰ء میں ۴٫۶۰ روپے کا تھا۔ آج ۱۶۰۰ روپے کے لگ بھگ ہے یعنی اب پاکستانی روپے کے مطابق ہمارے بیرونی قرضہ جات تقریباً چار گنا بڑھ گئے ہیں۔

اب بیرونی تجارت کے خسارے، کرنسی کی قیمت میں مزید کمی کو روکنے اور بیرونی قرضہ جات کو روکنے کے لیے غیر ملکی اشیاء کا استعمال بند کرنا ہوگا۔ اگر جاپان، امریکہ، روس، چین اور بھارت اپنی ترقی اور خوشحالی استحکام کے لیے درآمدات کو کنٹرول کر سکتے ہیں تو ہم ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔ امریکہ اور

یورپی منڈی نے تیسری دنیا کے ممالک سے روئی کی مصنوعات کی مخصوص مقدار مقرر کی ہوئی ہے۔ بھارت میں صرف ۱۵ اشیاء درآمد ہوتی ہیں مگر پاکستان ۴۵ اشیاء قانونی طور پر درآمد کرتا ہے اور باقی ان گنت سمگل ہو کر آتی ہیں۔

پاکستان اس وقت جن اقتصادی مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔ اس سے عہدہ برآ ہونے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ہر شخص تہیہ کرے کہ وہ پاکستانی مصنوعات استعمال کرے گا اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستانی مصنوعات کم معیار اور بلند قیمت ہیں مگر پاکستان کی ترقی و خوشحالی کے لیے یہ قربانی دینی ہوگی۔ اگر ہم سب پاکستانی انفرادی طور پر غیر ملکی اشیاء کا استعمال چھوڑ دیں تو درآمد شدہ اور سمگل شدہ مال دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ یہیں اُن لوگوں کو پاکستان کی اقتصادی تباہی کا ذمہ دار ٹھہرنا ہوگا جو غیر ملکی اشیاء کا استعمال کرتے ہیں۔ آپ ان کو ملک دشمن اور عوام دشمن سمجھیں اور اُن کو مجبور کریں کہ وہ پاکستانی مصنوعات استعمال کریں۔ اسی طرح وہ لوگ جنہوں نے بیرون ملک بنکوں میں اپنا سرمایہ اور دوسرے ممالک میں اثاثے خرید رکھیں وہ پاکستان منتقل کر کے پاکستان کو اقتصادی مشکلات سے نکالیں اور پاکستان کو ایک خوشحال ملک بنائیں۔

سرمایہ کاری

صنعتی سرمایہ کاری ایک ایسا عمل ہے جس سے پیداوار میں اضافہ اور روزگار کے مواقع بڑھتے ہیں۔ پیداوار میں اضافے سے اشیاء کا معیار بلند اور قیمتوں میں آہستہ آہستہ کمی واقع ہو جاتی ہے۔ یہ اضافہ غیر ملکی اشیاء کی ضرورت کو اگر ختم نہیں تو کم ضرور کر دیتا ہے اور بیرونی تجارت میں خسارے کی بجائے بتدریج منافع ہونے لگتا ہے۔ ملکی ضروریات پوری ہونے کی وجہ سے یہ اشیاء بیرونی منڈیوں میں فروخت کی جاتی ہیں۔ بیرونی منڈیوں میں یہ اشیاء اُس وقت بکتی ہیں جب ان کا معیار بہت اعلیٰ اور قیمت کم ہو جو کہ زیادہ پیداوار کا ایک قدرتی عمل ہے۔ بیرونی منڈیوں میں اشیاء بیچنے سے زرمبادلہ کے حصول و بیرونی تجارت میں زیادہ منافع کے باعث بیرونی قرضوں سے نجات ملتی ہے۔ جب غیر ملکی منڈیوں میں اپنے ملک کے مال کی ساکھ بن جائے تو صنعتی سرمایہ کاری میں تیزی آجاتی ہے جس سے ملک میں روزگار کے مزید مواقع بڑھتے ہیں اور ملک سے بیروزگاری آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے۔ روزگار کے مواقع بڑھنے سے لوگوں میں خوشحالی بڑھتی ہے اور اس خوشحالی کے دور میں صنعت کار اور ملازم پیشہ لوگ زیادہ ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ جس سے حکومت کے ذرائع و وسائل میں اضافہ ہوتا ہے۔ جو عوام کو بنیادی ضروریات و سہولتیں فراہم کرنے کا سبب بنتا ہے جیسے سکول و کالج ہسپتال وغیرہ جوں جوں حکومت کی طرف سے تعلیم و علاج معالجے کی سہولتیں بڑھیں گی۔ لوگ تعلیم یافتہ اور صحت مند ہو کر ملک و قوم کی تعمیر میں زیادہ حصہ لیں گے۔ یہ تعمیراتی دور اور ذرائع و وسائل میں اضافہ سائنسی اور صنعتی تحقیق و ترقی میں اضافہ کر کے ملک کی معیشت کو مضبوط ستون فراہم کرتا ہے۔ بیرونی تجارت کے خسارے اور بیرونی قرضہ جات کے ختم ہونے سے لوگوں کے پاس بے جا تنقید، منفی عوامل اور تخریبی کارروائیوں کے لیے وقت کم اور شعور زیادہ ہو جاتا ہے۔ جب بھی ووٹ کے استعمال کا موقع ملتا ہے تو تعلیم یافتہ باشعور اور خوشحال ہونے کے باعث وہ ووٹ فرقہ پرستی، ذات برادری، صوبائی تعصب، علاقائی دشمنیوں سے بالاتر ہو کر استعمال میں لا کر صحیح نمائندے چنتے ہیں یہ صحیح نمائندے ملک کی باگ دوڑ سنبھال کر ایسی ایسی ٹھوس پالیسیاں عمل میں لاتے ہیں کہ ملک کی ترقی کی رفتار اور بہتر ہو جاتی ہے جو ملک کو ایک طاقت بنا دیتی ہے۔ جاپان کی مثال آپکے سامنے ہے۔ جاپان نہ تو معدنی دولت سے مالا مال ہے اور نہ

ہی زراعت کے میدان میں کسی اہمیت کا مالک ہے۔ جاپان کی ترقی کا راز وہاں کے لوگوں کی محنت اور ملک و قوم کی خدمت ہے۔

تسکین و عزت افزائی زیادہ صنعتوں کے ہونے اور زیادہ مزدوروں کو ملازم رکھنے میں ڈھونڈنی چاہیے

یہ وہ جاپان ہے جو دوسری جنگِ عظیم میں بالکل تباہ ہو گیا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں کے بعد وہاں کے لوگوں نے نئے سرے سے ملک کی تعمیر شروع کی اور اس قدر محنت کی کہ ملک میں خام مال، معدنیات اور زرعی پیداوار کی کمی کو پورا کر لیا۔ اب بھی جاپانی تمام خام مال، پٹرول، اجناس دوسرے ممالک سے منگواتے ہیں مگر جاپان کا بنا ہوا مال آج پوری دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ جاپان والوں کی سائنسی و صنعتی ترقی نے پوری دنیا کو زیر کر دیا۔ اس طرح اب دنیا کی اقتصادی دوڑ میں ہانگ کانگ، کوریا، تائیوان اور سنگاپور بھی بہت آگے نکل چکے ہیں اور اب ترقی یافتہ ممالک میں شامل ہو گئے ہیں۔ ان تمام ممالک کی ترقی کا راز وہاں کے لوگوں کا صنعتی سرمایہ کاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا ہے

آج ہم معاشی، سیاسی اور دفاعی طور پر فقط اس لیے کمزور ہیں کہ بحیثیت قوم ہم لوگ سرمایہ کاری کی طرف توجہ نہیں دیتے۔

ہم اپنی تسکین اور عزت افزائی بڑی بڑی کاروں، محل نما

ہماری اقتصادی کمزوریوں کی وجہ سرمایہ کاری میں کمی ہے

گھروں، جشن نما شادیوں اور بیرے جواہرات میں ڈھونڈتے ہیں۔ ہمارا سکون دوسروں سے بڑھ کر خرچ کرنے میں ہے

جس سے ملک کی مجموعی بچت صرف ۵ فی صد ہے۔ یہ بچت ملکی ضروریات کو پورا کرنے والی صنعتی سرمایہ کاری کے لیے بہت کم ہے۔ چنانچہ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے بیرونی قرضہ جات کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ قرض دینے والے ممالک ایسی شرائط لاگو کرتے ہیں جس سے ہم مزید معاشی مشکلات میں پھنس چکے ہیں۔ ان معاشی مشکلات نے آج ملک کو ہر شعبے میں غیر ممالک سے مدد مانگنے پر مجبور کر دیا ہے جس سے حقیقی طور پر ہم ہر لحاظ سے دوسروں پر انحصار کر رہے ہیں۔

آج ملک جن مشکلات میں جکڑا گیا ہے ان سے نکلنے کی یہی صورت ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ صنعتی سرمایہ کاری کریں اس کے لیے ہمیں اپنے بے جا اخراجات پر قابو پا کر انتہائی سادہ زندگی بسر کرنی ہو گی۔ بچت میں اضافہ

آپ کی سرمایہ کاری عوام کو بیروزگاری سے نجات دلائے گی

کر کے صنعتی سرمایہ کاری کی طرف توجہ کرنی ہو گی۔ ہمیں بڑی صنعتوں کے مالک ہونے اور زیادہ مزدوروں کو ملازم رکھنے میں تسکین و عزت افزائی ڈھونڈنی چاہیے۔ ہمیں فخر اس بات پر ہونا چاہیے کہ ہم نے پاکستان سے سب سے زیادہ مال برآمد کیا یا پاکستان کے لیے سب سے زیادہ زرِ مبادلہ کمایا۔ ہمیں لمبی، بڑی اور نئی کاروں، بڑے بڑے گھروں اور بیرے جواہرات کی بجائے نئی نئی صنعتوں کے لگانے میں فخر محسوس کرنا چاہیے۔ یہ وہ سمت ہے جس سے آپ ملک کی خدمت کے علاوہ انسانیت کی خدمت بھی کریں گے اور پاکستان کو ایک معاشی اور فوجی طاقت بنانے میں مثبت کردار ادا کریں گے۔

وہ قابلِ تعظیم ہیں جو پاکستان کے لیے زرِ مبادلہ کماتے ہیں

قیمتوں میں اضافہ

قیمتوں میں اضافے کا باعث جہاں بے جا اصراف کرنے والے ہیں وہاں کاروباری لوگ بھی اس جرم میں برابر کے شریک ہیں۔ کاروباری طبقہ منافع کے نام پر من مانی قیمتیں لگاتا ہے۔ بدقسمتی سے منافع کا نہ تو کوئی کاروباری اصول ہے اور نہ ہی معاشیات کی طرف سے اس پر کوئی پابندی ہے۔ اخلاق و مذہب تو صرف مسجدوں و نمازوں تک محدود کر دیا گیا ہے۔ قانون جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں میں بے اثر ہے اسی طرح قیمتوں پر بھی اس کا کوئی کنٹرول نہیں ہے جس طرح ملازم پیشہ لوگ راتوں رات بڑے سے بڑے عہدوں پر پہنچنے کے لیے ہر جربہ استعمال کرتے ہیں بالکل اسی طرح کاروباری طبقہ دولت اکٹھی کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔ رمضان کا بابرکت مہینہ ہو یا سیلاب و مصیبت زدہ لوگ، عوام کا استحصال ہو رہا ہو یا ملک کی تباہی چھوٹے سے چھوٹا کاروباری ہو یا بڑے سے بڑا سرمایہ دار قیمتوں میں اضافے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ قیمتوں نے بڑھنا ہے۔ حکومت کسی قسم کا ٹیکس لگا دے، پٹرول کا نرخ بڑھا دے، ریلوے کرایہ میں اضافہ کر دے، فیکٹری بند ہو جائے، مزدور ہڑتال کر دیں وغیرہ ان تمام نقصانات کی ادائیگی عوام قیمتوں کی شکل میں ادا کریں گے۔

جب کاروباری طبقہ قیمتوں میں اضافہ کرتا ہے تو مزدور اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے تنخواہوں میں اضافہ چاہتے ہیں جب تنخواہیں بڑھتی ہیں تو قیمتوں میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح کبھی قیمتیں اور کبھی مزدوروں کی تنخواہوں کا بڑھنا ایک مستقل عمل ہے۔ مزدوروں کی تنخواہوں کی زیادتی نے پاکستانی مصنوعات کو دوسرے ممالک کے مقابلے میں بہت مہنگا کر دیا ہے جس سے پاکستانی مصنوعات بیرون ملک نہیں بکتیں۔ اسی طرح مشرق وسطیٰ سے پاکستانی مزدوروں کی جگہ فلپائن، برما، کوریا اور بھارت کے مزدوروں کو رکھا جا رہا ہے جو بہت کم تنخواہوں پر کام کرتے ہیں لیکن ان ممالک میں قیمتوں میں اضافہ اتنی تیزی سے نہیں ہو رہا ہے جس تیزی سے پاکستان میں ہو رہا ہے۔ ہمارے ملک میں کاروباری طبقے نے جس طرح لوٹ مچائی ہے اس قدر لوٹ پوری دنیا کے کسی ملک میں نہیں ہے۔ قیمتوں کے اس اضافے نے ملک میں دولت اکٹھا کرنے کی دوڑ لگا دی جس سے بے شمار نئے نئے سماجی معاشرتی و معاشی سیاسی مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔

کاروباری طبقہ سے گذارش ہے کہ وہ قیمتیں اعتدال میں رکھیں۔ منافع اُن کا حق ہے مگر عوام کی مجبوریوں اور ملکی مسائل کی حدود کو پار نہیں کرنا چاہیے۔ اپنے لاکھوں کروڑوں کمانے کے شوق میں ملک و قوم میں مسائل نہ پیدا کریں۔ ذاتی مفادات اور کنبہ پروری کی ہوس میں ملک و قوم کو تباہ نہ کریں۔

منافع کے نام پر غریب عوام کا استحصال بند کر دو!

خواتین

پاکستان کی آبادی میں ۵۵ فی صد خواتین اور ۴۵ فی صد مرد ہیں۔ خواتین میں کام کرنے کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے اور مردوں میں بچے، طالب علم اور بوڑھے کام نہیں کرتے۔ اگر تمام آبادی سے ان عورتوں، بچوں، طالب علموں اور بوڑھوں کو نکال دیا جائے تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ پاکستان کی تعمیر و ترقی میں براہ راست حصہ لینے والے لوگ کتنے ہیں۔ اس کے علاوہ اعداد و شمار دیکھنے یا سننے کا موقع

تو نہیں ملا مگر ایک محتاط اندازے کے مطابق یہ لوگ ۳۰ فیصد سے شاید زائد نہ ہوں۔ اب اسی تناسب سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۷۰ فی صد آبادی بے کار ہے اور ملک کے محدود وسائل پر بوجھ ہے یقیناً بچوں، طالب علموں اور بوڑھوں کو ہم بوجھ نہیں کہیں گے۔ یہ لوگ قوم کا سرمایہ ہیں مگر وہ خواتین جو کام کرنے کی اہل ہیں انہیں ملک کی خدمت سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا اور کام نہ کرنے والوں میں وہ خواتین بھی شامل ہیں جنہوں نے ملک کے ذرائع و وسائل کو استعمال کر کے تعلیم حاصل کی مگر اس کے بعد گھر کی چار دیواری میں بند ہو گئیں اور جو ملازمت اختیار کرتی ہیں۔ وہ شادی کے فوراً بعد گھر بیٹھ جاتی ہیں۔ ان عورتوں نے ایک طرف تو ملکی وسائل و ذرائع کو ضائع کیا اور دوسری طرف وہ ملک کے محدود وسائل پر بوجھ بھی بن گئیں۔ ایسی خواتین میں ڈاکٹر، لیکچرر وغیرہ کی تعداد خاصی زیادہ ہے۔

تعلیم حاصل کر کے گھر بیٹھ جانا ملکی وسائل کا ضیاع ہے

اگر تمام خواتین کی قوتوں کو بروئے کار لایا جائے تو ملک میں کام کرنے والے افراد کی تعداد دگنی ہو جائے گی۔ ہم نے مختلف باتوں میں، ملکی اشیاء کے استعمال کو فروغ دے کر صنعتوں میں اضافے، بچت بڑھا کر سرمایہ کاری کرنے، کمپیوٹر اور خود کار مشینوں کا استعمال بند کرنے کی تجاویز اسی لیے پیش کیں تاکہ لوگوں کے کام کرنے کی صلاحیت کو استعمال کیا جائے اور بیروزگاری ختم کی جائے۔ ہمارے ملک میں تو مرد بیروزگار ہیں۔ خواتین کے لیے مشکلات تو اس سے بھی زیادہ ہیں، لیکن وہ خواتین جنھیں ملازمت آسانی سے مل سکتی ہے انھیں ملک و قوم کے وسیع تر مفاد کی خاطر گھر کی چار دیواری سے نکل کر ملک و قوم کی تعمیر میں حصہ ضرور لینا چاہیے۔ اس کے علاوہ وہ تعلیم یافتہ یا غیر تعلیم یافتہ خواتین جن کو ملازمت نہیں مل سکتی وہ گھر میں ایسے کام کر سکتیں جس سے ملک کی تعمیر و ترقی میں کچھ نہ کچھ کردار ادا ہو جائے گا مثلاً سلائی کڑھائی، بُنائی، سجاوٹ کی چھوٹی چھوٹی اشیاء بنا کر بازار میں دینا۔ گھروں میں ٹیوشن سنٹر چلانا، نرسری بومز کا بندوبست، گھروں میں کھانے پینے کی اشیاء بنا کر بیکریوں میں دینا وغیرہ آپ مالی طور پر کتنے ہی مضبوط کیوں نہ ہوں، آپکے والد صاحب یا خاوند کتنے ہی دولت مند کیوں نہ ہوں آپ کو اپنی قوتوں اور وقت کا صحیح استعمال کر کے ملک و قوم کی خدمت کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کام ضرور کرنا ہے۔

دوسری طرف آپ خواتین ماں اور بیوی کی حیثیت سے گھریلو اخراجات میں مداخلت بہت زیادہ ہوتی ہے اگر یہ کہا جائے کہ گھریلو اخراجات آپ خواتین ہی کرتی ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ بچت کی جائے یا اخراجات بڑھائے جائیں۔ عورتیں جہاں بھی اکٹھی ہوں گی اکثر و بیشتر اپنی خرید کی باتیں کر رہی ہوں گی۔ کپڑا، زیورات، آسائش و آرائش اور زیبائش کا سامان ان کے مقبول ترین موضوعات ہیں۔ محفلوں، شادیوں اور دوسرے اجتماعات میں عورتیں ایک دوسرے سے مقابلہ بھی کرتی ہیں۔ یہ

عورت ایک اچھی ماں بن کر قوم کی تاریخ بدل سکتی ہے

مقابلہ نئی و مہنگی زیبائش اشیاء کے استعمال میں ہوتا ہے۔ دوسری خواتین کو زیر کرنے اور اپنی شخصیت کو اجاگر کرنے کے لیے عورتیں خاوندوں کو مزید دولت کمانے کے لیے زور دیتی ہیں جس سے اہل خانہ مردوں کو دولت کمانے کی دوڑ میں شریک کر کے ان کو رشوت اور ناجائز ذرائع سے دولت کمانے کے غلط راستوں پر لے جاتی ہیں۔ اکثر مرد حضرات اپنے اہل خانہ خواتین اور بچوں کی غیر ضروری اور نمود و نمائش کی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے بھٹک جاتے

ہیں اور کنبہ پروری کے لیے ملک و قوم کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ آپ صرف جہیز کی مثال لیجیے بچپن سے سنتے آ رہے ہیں کہ صاحب یہ بہت بڑی لعنت ہے جس نے ملک کو لوٹ لیا اور عوام کا سکون چھین لیا۔ آج ہزاروں بہنیں و بیٹیاں بیچاری جہیز کے زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے کنواری بیٹھی اپنی جوانی تباہ کر رہی ہیں مگر اس کا قصوروار کون ہے؟ تجزیہ یہ بتاتا ہے کہ یہ لڑکے کی ماں، بہن اور

خواتین سادگی اختیار کر کے اہل خانہ مردوں کو رشوت و ناجائز ذرائع کے ذریعے دولت کمانے سے روک سکتی ہے

بھابیاں ہی تو ہیں جو معاشرے میں عزت، لڑکی کی اپنی ضرورت، لڑکی کے ماں باپ کی خوشی وغیرہ کے نام پر لڑکی والوں سے جہیز وصول کر لیتی ہیں۔ اس کے علاوہ شادی کی دوسری تمام رسومات پر اخراجات بھی انہی عورتوں کے ایما پر ہوتے ہیں۔ یہ عورتیں ہی ہیں جو نئی نئی رسومات کی بانی اور پرانی رسموں کو برقرار رکھتی ہیں۔ کچھ لوگ لڑکے کی لالچ اور خودغرضی کو بھی ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو محترمہ والدہ، بہن اور بھابی صاحبہ کیا لڑکے کو مجبور نہیں کر سکتیں کہ وہ لالچ نہ کرے؟ اگر عورتیں چاہیں تو جہیز کی لعنت آج ہی ختم ہو سکتی ہے۔ یہ عورتیں ہی اتنے بڑے اور سنگین مسئلے کو حل کر سکتی ہیں جب تک عورتیں اپنی عزت و تسکین زیادہ جہیز اور رسومات کے اخراجات میں تلاش کرتی رہیں گی ملک میں سماجی مسائل بڑھتے رہیں گے۔ دوسری طرف اگر عورتیں سینے میں ایک ماں کا دل رکھتے ہوئے یتیم بچوں، بہنوں اور بیٹیوں کی پرورش، ہسپتال میں پڑے بیماروں کی تیمارداری، بوڑھوں کا سہارا بننے میں اپنا سکون تلاش کریں تو وہ نہ صرف ملک کی بہت بڑی خدمت کریں گی بلکہ انسانیت پر احسان بھی ہوگا۔ اسی طرح جہیز کی لعنت آپ خواتین کی خصوصی توجہ کی طلب گار ہے۔ آپ اس لعنت کو ختم کر کے ملک میں رشوت و ناجائز ذرائع سے دولت کمانے میں کمی کریں گی۔ دوسری طرف ہزارہا بچیاں جو جہیز نہ ہونے سے کنواری بیٹھی ہیں ان کی شادی میں آسانی پیدا ہوگی جس سے عوام کو بہت ذہنی سکون ملے گا۔

لڑکی والوں سے کسی بھی وجہ سے جہیز قبول کرنا بے حسی، خودغرضی، دولت کی لالچ اور لاکھوں بہنوں بیٹیوں سے دشمنی کرنا ہے

اس طرح زندگی میں اپنے آپ کو سادہ ترین بنا کر ملک سے دولت اکٹھا کرنے اور اس کو خرچ کرنے کی دوڑ کو ختم کریں۔ دوسری عورتوں سے مقابلہ سماجی خدمات میں حصہ لے کر کریں۔ فخر و تسکین یتیم لڑکوں کو پالنے، یتیم بچیوں کی شادی اور غریب پروری میں ڈھونڈیں۔

ماں کی گود تعلیم کا سب سے بڑا گہوارہ ہے۔ بچوں کی شخصیت اس جگہ سے بنتی و بگڑتی ہے۔ بچے اپنے بڑوں اور خاص طور پر ماں اور اس کے بعد باپ کی عملی زندگی کو اپنا لیتے ہیں۔ اب جو کچھ بھی عملی طور پر اُن کے سامنے کریں گے بچے اکثر و بیشتر آپ کے نقش قدم پر چلیں گے۔ آپ اپنے بچوں میں اپنے جیسی عادات و اطوار، خیالات و نظریات پائیں گے، ان میں یقیناً کچھ کمی بیشی ہو سکتی ہے لیکن بنیادی طور آپ کے بچوں کی شخصیت آپ کی شخصیت کا ایک نمونہ ہوگی۔

ملکی و قومی مشکلات کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ماں باپ بچوں کے سامنے ملک و قوم کی خدمت کا عملی نمونہ پیش نہیں کرتے جس سے ہماری موجودہ نسل اور آنے والی نسل ملک و قوم کی خدمت سے بالکل آشنا نہیں ہے۔

آپ خواتین نہ صرف اپنے بچوں بلکہ ایک ماں، بہن، بیوی اور بیٹی ہونے کے ناطے اہل خانہ مردوں کو راہِ راست پر لاکر ملک و قوم کی خدمت کی طرف مائل کر سکتی ہیں اسی مشن کی تکمیل کے لیے آپ مندرجہ ذیل باتوں کو ذہن میں رکھیں اور عملی جامہ پہنائیں۔

جہیز لے کر آنے والی لڑکی ان جرائم میں برابر کی شریک ہے

۱۔ اپنی زندگی کو نمود و نمائش سے پاک کر کے سادگی اختیار کریں اور اسی کا پرچار بھی کریں۔

۲۔ عزت و تسکین، آسائش و زیبائش کی اشیا میں نہیں۔ بلکہ بچت، غریبوں، یتیموں، بے سہارا کی مدد اور سماجی کاموں میں تلاش کریں۔

۳۔ جہیز کی لعنت کی ذمہ داری زیادہ تر خواتین پر آتی ہے آپ ایک ماں، بہن اور بھابی کے ناطے معاشرے کو اس لعنت سے پاک کرنے کے لیے اپنے بیٹوں، بھائیوں اور دوسرے عزیزوں کی شادیوں میں اس کا وجود ختم کریں۔

۴۔ تعلیم حاصل کر کے ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے مردوں کا ساتھ دیں اور ملک کے لیے کام کرنے والی قوت کو دوگنا کریں۔

۵۔ اپنے بھائی، خاوند اور بیٹوں کو رشوت، سفارش کی لعنت سے پاک رہنے کی جدوجہد کریں۔

۶۔ بچوں کو خودغرضی، ذاتی مفادات سے پاک رہنے اور ان میں ملک و قوم کی خدمت کرنے کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے اُن کے سامنے عملی نمونہ پیش کریں۔

آج ملک و قوم کو آپ کے مثبت کردار کی اشد ضرورت ہے

* * * * * *

قارئینِ میثاق کے لیے اطلاع

کاغذ کی قیمت میں اچانک اضافہ کے باعث ہم یہ ناخوشگوار فیصلہ کرنے پر مجبور ہیں کہ جنوری ۱۹۸۷ء سے ماہنامہ 'میثاق' کا اندرونِ پاکستان سالانہ زرِتعاون ۵۰/ روپے اور ہدیہ فی شمارہ ۵/۰ روپے ہوگا۔ تاہم بیرونِ ممالک کے لیے زرِتعاون میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

نوٹ: منی آرڈر کی صورت میں زرِتعاون مینیجر ماہنامہ 'میثاق'، لاہور کے نام ارسال کریں اور ڈرافٹ بھجوانے کی صورت میں ماہنامہ میثاق لاہور کے نام کا ڈرافٹ بنوائیں یا اکاؤنٹ نمبر ۹۷۵۵ یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ ماڈل ٹاؤن برانچ لاہور تحریر فرمائیں

(ادارہ)

مرتب: چودھری غلام محمد

لاہور میں توسیعِ دعوت کا پروگرام

تنظیم اسلامی کی انقلابی دعوت کا منبع و سرچشمہ قرآن حکیم ہے اور انقلاب اسلامی کے لئے پیش رفت کے مدارج و مراحل کا تعین سیرتِ طیبہ کی روشنی میں واضح ہو جاتا ہے۔ الحمدللہ تنظیم اسلامی کے رفقاء و احباب کی تربیت کے لئے ان کی تعلیم و تدریس اور تفہیم کا اہتمام تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام مرکزی اور علاقائی تربیت گاہوں میں بحسن و خوبی ہوتا رہتا ہے۔ تاہم اس ضرورت کا احساس موجود تھا کہ ماحول کے اثرات بہت قوی اور ذاتی مسائل اور پریشانیوں کے تقاضے بہت شدید ہیں۔ اس لئے مطالباتِ دین کا صرف علمی شعور شاید ان تقاضوں کی دستبرد سے محفوظ نہ رکھ سکے اور رفقاء اپنی زندگی کے نقشہ میں وہ تبدیلی پیدا نہ کر سکیں جو ایک اسلامی انقلابی جماعت کے رکن کی ابتدائی ضرورت ہے۔ لہٰذا میاں محمد نعیم قیم تنظیم اسلامی نے رفقاء کے مشورہ سے طے کیا کہ اب جو لائحہ عمل ہمارے پیشِ نظر ہونا چاہیئے اس میں تنظیم اسلامی کے فکر و دعوت کی تعلیم و تدریس کے پورے اہتمام کے ساتھ ساتھ ایسے پروگرام مرتب ہونے چاہئیں جن میں رفقاء متحرک ہوں۔ وہ مختلف اور مناسب انداز میں اپنے ماحول اور گھروں سے توسیعِ دعوت کی کوشش کے لئے نکلیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے گذشتہ چند ماہ سے اس رُخ پر کچھ محنت ہوئی ہے اور اس کے بہت مفید نتائج ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔ ابتداءً اس رُخ پر کام کرنے کے لئے ضروری ہدایات پر مشتمل ایک خاکہ مرتب کیا گیا تھا اور تفصیلی عملی اقدامات کے لئے مختلف مقامات پر رفقاء کو مقامی حالات کی مناسبت سے کام کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا تھا۔

لاہور میں اس نہج پر کام کرنے کے لئے رفقاء کو اپنی مصروفیات سے کچھ وقت بچا کر دین کے لئے فارغ کرنے کی ترغیب و تشویق دی گئی۔ ایک سوالنامہ کے ذریعے رفقاء کی صلاحیتوں اور فارغ اوقات کا اندازہ کیا گیا۔ البتہ اس سلسلہ میں پیش قدمی رفقاء کی اپنی صوابدید پر چھوڑ دی گئی۔ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہوا کہ گوناگوں مشکلات کے باوجود رفقاء کی ایک اچھی خاصی تعداد نے خود پیشقدمی کی۔ قریباً ساٹھ رفقاء نے اندرونِ شہر کام کرنے کے لئے مہینے میں دو دن فارغ کئے اور ۲۳ رفقاء نے بیرون لاہور کام کرنے کے لئے مہینے میں تین دن فارغ کئے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے رفقاء کے ان اوقات کا بھرپور استعمال کیا گیا اور رفقاء کے گروپ بنا کر مختلف اوقات میں اندرون و بیرون لاہور کام کے لئے بھیجا گیا۔ سب سے پہلے رفقائے تنظیم اسلامی نے وزیر آباد اور گجرات کے نواح میں بہت مفید دعوتی کام سرانجام دیا۔ ان کے سہ روزہ دورہ کے

دوران کافی لوگ تنظیم اسلامی کی دعوت سے متعارف ہوئے۔ رفقاء بھی نظم کے خوگر ہوئے۔ باہم تفصیلی تعارف کے مواقع میسر آئے۔ اس سہ روزہ دورہ کے دعوتی اثرات کا رفیق محترم جناب شمس الحق اعوان صاحب نے کامیاب تعاقب کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی محنت کو شرف قبولیت عطا کیا اور انہیں اسی حلقہ تعارف میں سے بہت سرگرم اور دردمند رفقائے کار مل گئے۔ جناب شمس الحق صاحب نے ان کی تربیت پر خصوصی توجہ دی اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں دین کی محبت اور اس کی سربلندی کے لئے تڑپ مزید دوبالا کر دی اور ان رفقاء کی مشترکہ سعی بارگاہ الٰہی میں اس طرح مقبول ہوئی کہ آج ان کے ساتھ پچاس رفقاء کا ایک قافلہ خدمت و دعوت دین میں سرگرم عمل ہے۔

اندرون لاہور کا دعوتی پروگرام والٹن، شاہدرہ، فیروز والا، ٹاؤن شپ اور گرین ٹاؤن کی بستیوں میں وقتاً فوقتاً رفقاء کے مختلف گروپس کے دو روزہ قیام اور مختلف النوع دعوتی و تربیتی امور کی انجام دہی پر مشتمل تھا۔ تعارف و توسیع دعوت کے پروگرام میں لوگوں سے ملاقاتیں، گفتگو، تقسیم لٹریچر، تعارفی پمفلٹ اور رابطہ کے لئے تیار کردہ خصوصی ہینڈ بلز وغیرہ کی تقسیم اور خطابات عام شامل تھے۔ اور ذاتی تربیت کا پروگرام نوافل، اذکار مسنونہ، تزکیہ نفس اور انقلابی تحریکوں کے متعلق مضامین کے اجتماعی مطالعہ و مذاکرہ پر مشتمل تھا۔ اس کے ساتھ رفقاء کو باہم تفصیلی تعارف اور ربط و تعلق کے قیمتی مواقع بھی میسر آئے۔ شروع میں اگرچہ مساجد ہی کو مستقر بنایا گیا تھا لیکن بعد میں محسوس ہوا کہ ذاتی تربیت کے لئے تو بے شک مساجد میں قیام مفید ہے لیکن دعوتی مقاصد کے لئے کچھ زیادہ موزوں نہیں۔ چنانچہ بعد کے پروگراموں میں کسی مناسب عوامی جگہ کو مرکز بنایا گیا۔ پروگرام کے اختتام پر وہیں پر لوگوں کو جمع کر کے خطاب عام کی صورت میں تنظیم اسلامی کی دعوت پیش کی گئی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ان پروگراموں کے دوران رفقاء نے پوری دلجمعی اور انبساط قلب کے ساتھ اور امکانی حد تک بھرپور دعوتی کام کیا اور مختلف تجربات سے دوچار ہوتے ہوئے خوب سے خوب تر کی طرف قدم بڑھاتے رہے۔ دعوتی پروگرام کے سلسلہ میں متعلقہ علاقہ کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا اور ہر حصہ کے لئے چار یا پانچ رفقاء پر مشتمل ایک گروپ تشکیل دیا گیا جس کا باقاعدہ امیر نامزد کیا گیا اور مقامی رفیق کو رہبر یا معاون کی حیثیت سے ساتھ کر دیا گیا۔ دعوت کی بنیاد تنظیم اسلامی کے چہار ورقہ "اسلام کا انقلابی منشور اور تنظیم اسلامی کا تعارف" کو بنایا گیا۔ اس کو پیش کرنے کے لئے ایک ہینڈ بل بھی تیار کیا گیا تھا جس میں مختلف سطحوں پر اسلام کی برکات کے تذکرہ کے بعد انفرادی اور اجتماعی سطح پر ہماری زبوں حالی کے واحد علاج کے طور پر روح جہاد کو زندہ کرنے کی طرف متوجہ کیا گیا تھا۔ ہر گروپ کے امیر نے گھروں دکانوں۔ راستوں اور بازاروں میں لوگوں سے گفتگو کی اور اسلام کا پیغام پہنچایا۔ پروگرام کے اختتام پر رفقاء کچھ دیر کے لئے باہم مل کر اپنی کارکردگی پر نگاہ بازگشت بھی ڈالتے رہے۔ اس طرح اپنی کوتاہیوں اور پیش آمدہ رکاوٹوں کا اندازہ بھی ہوتا رہا اور تجربات و مشاہدات کی روشنی میں آئندہ پروگراموں کی تشکیل

کے راستے بھی متعیّن ہوئے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان اور توفیق خصوصی سے لاہور اور اس کے گرد و نواح میں توسیع دعوت کے لئے جو محنت اور کوشش شروع کی گئی تھی۔ اس کے بہت قابل قدر ثمرات محسوس کئے گئے ہیں۔ ہمارے پیش نظر یہ تھا کہ اللہ تعالےٰ اپنی رحمتِ خصوصی سے ہمارے لئے وہ راستہ آسان کردے جس سے مندرجہ ذیل مقاصد حاصل ہوسکیں۔

۱۔ قرآن مجید اور سیرتِ مطہرہ کی روشنی میں ایک بندہ مومن کی ضروریات کا فہم اور اس کے اظہار و اعلان کی طبعاً جرأت۔

۲۔ اپنے سیرت و کردار کے محاسبہ اور دعوت و تذکیر کے بعد عمل کی کوتاہیوں پر غور و فکر اور مل جل کر اصلاح کی کوشش۔

۳۔ شعوری جائزہ کے بعد کوتاہیوں پر استغفار اور صحیح عمل کی توفیق پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا۔ اور آئندہ کے لئے اللہ تعالےٰ سے خصوصی دعائیں اور اظہار عجز و نیاز

۴۔ اپنے گھر اور ماحول کی سہولتوں کو چھوڑ کر سخت کوشی اور محرومیوں کا خوگر ہونا اور اس بیرونی فضا کی ضرورتوں کے حوالے سے باہم مشورہ کے آداب سے آگاہی، نظم و ضبط کی تربیت۔ باہمی محبّت، ہمدردی، تعاون اور اخوت کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہونا۔

۵۔ دعوت و تذکیر کے مناسب انداز کی تربیت۔

۶۔ دعوت کے نتیجہ میں طنز و استہزا، کشمکش اور رکاوٹوں پر صبر و استقامت اور نامساعد حالات میں اللہ تعالیٰ پر توکّل و اعتماد اور تسلیم و رضا کی روش اختیار کرنا۔

مذکورہ بالا مقاصد کے علمی شعور کے باوجود اپنی کوتاہ ہمتی کے سبب ہم ان تک رسائی کی عملی صورت تلاش نہیں کر پا رہے تھے۔ ہم اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ جب ہمارے کچھ رفقاء نے ہمّت کر کے بہت تھوڑے سے وقت کے لئے اپنے گھر اور ماحول کی مصروفیات اور آرام کو اللہ کے لئے چھوڑا تو اللہ تعالےٰ کی رحمت نے ان کی دستگیری فرمائی اور وہ ذہنی، قلبی اور روحانی برکات کو سمیٹتے ہوئے گھروں کو لوٹے۔

دوسرے مقامات پر بھی بفضلہٖ تعالیٰ تنظیم اسلامی کی پیش رفت کے ضمن میں صورت حال حوصلہ افزا رہی۔ کراچی میں تنظیم اسلامی کی تنظیم نو کی گئی۔ رفقاء کی تعداد ۱۵۰ سے متجاوز ہے۔ بہتر کارکردگی کے لئے اس کو چھوٹے چھوٹے اسرہ جات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پروگراموں کو نئے انداز اور نئی ترتیب سے اس طرح جاری کیا گیا کہ بعض کمزوریوں کا ازالہ اور کچھ مفید پہلوؤں کا اضافہ ہو سکے۔ نقیب حضرات (ناظمین اسرہ جات) کی تربیت پر خصوصی توجہ دی گئی۔ انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام ایک اکیس روزہ

تربیت گاہ کا اہتمام ہوا جس کے لئے ہمارے رفقار نے خوب محنت کی اور بھرپور استفادہ کیا۔ جناب مختار حسین فاروقی صاحب نے رفقار کو متحرک کرنے کے لئے تدابیر اختیار کیں۔ باہم رابطہ اور رفقار کے مسائل سے آگاہی کی خاطر رفقار سے انفرادی ملاقاتوں کا سلسلہ پورے اہتمام کے ساتھ جاری رکھا — الحمدللہ اب رفقار سے رابطہ اور رفقار کے باہم ربط و ضبط کی کیفیت بہت حوصلہ افزار ہے رفقار کو گھر اور ماحول سے نکال کر متحرک کرنے کے باقاعدہ پروگرام ابھی نہیں بن سکے۔ تاہم اس ضمن میں بھی کچھ پیش رفت ہوئی ہے۔ چھ چھ رفقار کے دو گروپوں نے حیدرآباد۔ ٹنڈوالہ یار اور بدین کے دعوتی سفر کئے اور ان کے مفید اثرات محسوس ہوئے۔ مزید پروگراموں کی تشکیل کے لئے حیدرآباد اور سکھر کی تنظیموں کے امرار سے مشورہ جاری ہے۔

کوئٹہ میں تنظیم اسلامی کے دعوتی تنظیمی اور تعلیمی پروگرام حسب معمول جاری رہے۔ مختلف مواقع پر رفقار نے خصوصی رابطہ مہم کے لئے محنت کی۔ شہری علاقہ کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے رفقار گروپس کی شکل میں نکلے اور تنظیم اسلامی کے تعارفی کتابچہ کو کافی تعداد میں تقسیم کیا۔ دوسرے مقامات پر بھی اسی طور سے کچھ مفید کام ہوا۔ لیکن اس کی تفصیلات تاحال مرکز میں نہیں پہنچیں۔

متذکرہ بالا پروگراموں کے علاوہ تنظیم اسلامی کی مرکزی تربیت گاہ میں گذشتہ دو ماہ کے دوران مسلسل تربیتی پروگرام جاری رہے۔ تنظیم اسلامی لاہور کے تمام، سرہ جات کا ایک ہفت روزہ نظام العمل بنایا گیا جس کے مطابق روزانہ چند اسرہ جات کے رفقار قرآن اکیڈمی لاہور میں شب بسری کرتے رہے۔ اس دوران ان کے لئے باہم ربط و ضبط، ایک دوسرے کے مسائل و مشکلات سے آگاہی جناب امیر تنظیم اسلامی سے انفرادی ملاقات اور وعظ و تلقین کے مواقع میسر رہے۔ کافی عرصہ سے جناب امیر تنظیم اسلامی کی رفقار سے انفرادی ملاقاتوں کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ لیکن جناب امیر تنظیم اسلامی کی شدید مصروفیات کی وجہ سے اس کا موقع میسر نہیں آرہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہوا کہ لاہور اور بیرون لاہور سے آئے ہوئے رفقار کی جناب امیر محترم سے تفصیلی ملاقاتوں کا اہتمام ہوا اور انہیں رفقار کے ذاتی مسائل سے واقفیت ہوئی۔ اسی طرح انہی مقاصد کی خاطر بیرون لاہور کے رفقار کے لئے مسلسل ہفت روزہ تربیتی پروگراموں کا اجرار کیا گیا مختلف مقامات سے رفقار اپنی فرصت و سہولت کے مطابق کسی ہفت روزہ میں بھی شریک ہو سکتے تھے۔ ابتداً اس کا نتیجہ بھی حوصلہ افزار رہا۔ لیکن بعض دشواریوں کی وجہ سے یہ سلسلہ زیادہ دیر تک جاری نہیں رکھا جا سکا اور جناب امیر تنظیم اسلامی کے عازم مکہ ہونے کی وجہ سے بھی اس سلسلہ کو منقطع کرنا پڑا۔

مختلف قومی تقریبات اور دینی اجتماعات کے مواقع پر بھی تنظیم اسلامی کے رفقار نے توسیع دعوت اور تربیتی مقاصد کی خاطر بھرپور کام کیا ہے۔ تبلیغی جماعت کے حالیہ منعقدہ سالانہ اجتماع میں

(باقی ص ۹۶ پر)

افکار و آراء

احوالِ وطن: ایران سے چند تاثرات

بریگیڈیئر عبدالرحمٰن صدیقی

ایران سے متعلق کوئی بھی بات کہتے ہوئے ایک بنیادی نکتہ ضرور ذہن نشین کر لینا چاہیئے اور وہ یہ کہ انقلاب روس اور چین کے بعد فی زمانہ یہ ایسا ملک ہے جو بیک وقت جنگ اور انقلاب کے دہرے بحران سے گذر رہا ہے ——— یہ دونوں بحران نہ صرف شدت بلکہ طوالت کے لحاظ سے بھی انتہائی غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں چنانچہ اہل ایران اس وقت جس کیفیت سے دوچار ہیں اسے کسی طرح بھی نارمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ ایک ایسی انوکھی اور غیر معمولی کیفیت ہوتی ہے جس میں عقل، جذبے اور جذبہ عقل سے متصادم ہوتا ہے اور کم از کم مجھ جیسے ایک غیر ملکی مبصر کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ کہ کون کس پر حاوی ہے تاہم اکثر اوقات بحیثیت مجموعی عقل پر جذبے کی حکمرانی ہوتی ہے؟ اور معقول اور مدلل بحث کی یا تو زیادہ گنجائش نہیں رہتی یا پھر دلیل کا دار و مدار اکثر پہلے سے طے شدہ نظریات اور نتائج پر ہوتا ہے اور عملاً یہ ناممکن ہوتا ہے کہ استدلال کو اس حد تک بڑھا دیا جائے جہاں وہ تعصب سے آزاد ہو کر صرف منطق کے تابع ہو جائے۔ اس میں شک نہیں کہ موت یا زیست کی جس اجتماعی کشمکش سے اہل ایران گذر رہے ہیں۔ اس میں منطق سے بیزاری کے علاوہ عام روابط اور تعلقات میں بھی عدم برداشت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے اور وہ اپنے معاملات پر کسی قسم کی بھی طویل اور مدلل بحث کو یا تو ہوں ہاں کر کے ٹال دیتے ہیں اور یا دخل در معقولات سمجھ کر ناراضگی کے اظہار میں تامل نہیں کرتے ان کا ایک ہی موقف ہے اور وہ ہے یہ کہ اگر تم ہمارے ساتھ نہیں ہو تو پھر ہمارے خلاف ہو۔

اس میں شک نہیں کہ ایران اس وقت بالکل کٹ کر رہ گیا ہے۔ عراق سے تو خیر اس کی باقاعدہ جنگ ہے مگر باقی دنیا سے بھی اس کے روابط ہر گز معمول کے مطابق نہیں۔ امریکہ روس، اسرائیل اور مغربی دنیا کے بیشتر ممالک سے اسے نہ صرف گلہ بلکہ سخت نفرت ہے جس کا اظہار برملا کیا جاتا ہے۔ خاص کر امریکہ اور روس کا ذکر تو بجز لعنت ملامت اور مردہ باد کے کچھ اور نہیں ہوتا۔ چپے چپے پر مرگ بر امریکہ اور مرگ بر روس کے نعرے نظر آتے ہیں۔ ایران نے اپنے اوپر مظلومیت اور عالم بیزاری کا ایک ایسا احساس طاری کر لیا ہے کہ اسے اپنے چاروں طرف ظالم ہی ظالم اور دشمن ہی دشمن نظر آتے ہیں۔ جن سے وہ تنہا برد آزما ہے۔ وہ اپنی اس جنگ کو حق و انصاف کی جنگ سمجھتا ہے جس میں اس کا کوئی ساتھی اور حمایتی نہیں

یہ جنگ وہ تنہا لڑ رہا ہے اور آئندہ بھی اسے ایسا ہی کرنا ہوگا۔ وہ نہ صرف اپنے آپ کو اور اپنے موقف کو حق و انصاف پر مبنی سمجھتا ہے بلکہ یہ بھی کہتا ہے جو دوست ملک دوستی کا دم بھرنے کے ساتھ ساتھ کھل کر اس کے موقف کی حمایت نہ کرے وہ دراصل ظلم اور ناانصافی کا ساتھ دے رہا ہے۔

لہٰذا ایران کے متعلق کوئی بھی رائے قائم کرتے وقت اور اس سے کوئی بھی بات منسوب کرنے سے پہلے اگر یہ چند معروضات ذہن نشین کر لی جائیں تو اکثر غلط فہمیوں کا ازخود ازالہ ہو جائے گا۔ ضروری نہیں کہ اگر پاکستان جیسے دوست ممالک کے بارے میں ایرانی عوام یا قائدین کوئی کڑوی بات کہیں تو اس میں واقعی عداوت اور مخالفت کا کوئی گہرا جذبہ بھی کارفرما ہو کیونکہ تند و تیز طرز کلام اور درشت لب و لہجہ اب ان کی غیر معمولی نفسیات کا ایک حصہ بن چکا ہے اور اس کا اطلاق نہ صرف غیروں پر بلکہ اکثر خود اپنوں پر بھی ہوتا ہے۔

جس روز (۱۶ ستمبر) میں تہران پہنچا اسی روز لاہور اور پنجاب کے چند دوسرے علاقوں میں شیعہ سنی تصادم کی خبریں آئی تھیں۔ ہر چند کہ یہ تصادم انتہائی افسوسناک تھا اور کوئی پاکستانی اس پر بے چینی اور تاسف کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا مگر اس بارے میں جس انداز کا اظہار میرے ایرانی دوستوں نے کیا وہ میرے لئے نہ صرف غیر معمولی بلکہ ایک حد تک پریشان کن بھی تھا۔ بھلا یہ کہاں تک جائز اور منطقی ہے کہ ایک ایسا ملک جو خود برادر اسلامی ملک سے برسرپیکار ہو ایک عام شہری تصادم کے متعلق صرف اس لئے مضطرب ہو کہ وہ ایک ہی ملک کے دو فرقوں کے چند افراد کے مابین ہوا ہو۔ پاکستان میں فساد یا انتشار کی کسی بھی خبر پر ایران جیسے دوست ممالک کا اظہار اضطراب تو یقیناً جائز اور مستحسن قرار دیا جا سکتا ہے مگر ایک فرقے کے مقابلے میں دوسرے فرقے کی حمایت اگر پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت سے ملتی جلتی کوئی چیز نہیں تو اسے ان امور میں حد سے بڑھی ہوئی (اور بالکل غیر ضروری) دلچسپی ضرور قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس خبر کو ایرانی ذرائع ابلاغ، روزناموں ٹیلی ویژن اور ریڈیو نے خاصا اچھالا۔ نیز امام کاشانی نے نماز جمعہ کے موقع پر اپنے خطبہ میں بھی اس کی تفصیلی رپورٹ بھی پیش کی۔ یہ رپورٹ لگ بھگ دس منٹ ٹی وی پر دکھائی گئی۔ مختلف مناظر میں ہجوم اور پولیس کے درمیان فائرنگ کی تصویریں تھیں اور ایک مقام پر پاکستان پیپلز پارٹی کے جھنڈے کو بھی بہت نمایاں کر کے دکھایا گیا تھا۔

جہاں اہل تشیع کے بارے میں ایران کی دلچسپی ایک قدرتی امر ہے وہاں اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے جان و مال کا تحفظ خود اس ملک کی گورنمنٹ، انتظامیہ اور عوام و خواص کی ذمہ داری ہے جہاں وہ آباد ہیں اور کوئی بھی دوسرا ملک محض اس بنا پر کہ دنیا میں انکی سب سے بڑی اکثریت وہاں آباد ہے ان کی حمایت کا دعویدار نہیں بن سکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایران کے پڑوسی ملک اکثر "صدر انقلاب" یعنی انقلاب ایران کے فرقہ وارانہ اثرات

کی برآمد کے بارے میں اکثر خدشات کا اظہار کرتے ہیں۔

یہ خود ایران اور اس کے اسلامی انقلاب کے حق میں ہوگا کہ وہ جہاں تک بھی ممکن ہو شیعہ سنی معاملات میں اس قسم کی دلچسپی کے اظہار سے احتراز کرے جس میں کسی اسلامی ملک کے اندرونی امور میں مداخلت کا ذرا سا بھی شائبہ ہو۔ پاکستان پیپلز پارٹی اور خاص کر مس بے نظیر بھٹو کے مستقبل میں میرے ایرانی میزبانوں کی دلچسپی ضرورت سے کچھ زیادہ ہی بڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کہ یہ ایک خالص سیاسی مسئلہ ہے مگر اس میں بھی فرقہ وارانہ عصبیت کا پہلو نمایاں تھا۔

پاکستان میں جمہوری عمل کی بحالی کے بارے میں اہل ایران کچھ زیادہ مطمئن نظر نہیں آتے اور انہیں یہ کہنے میں ذرا باک نہیں کہ مارشل لاء اٹھائے جانے کے باوجود پاکستان میں ہنوز سول نظام نے جڑ نہیں پکڑی۔ اس ضمن میں وہ بہت فخر سے اپنے پارلیمانی اور صدارتی انتخابات کا ذکر کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں یہ انتخابات عین پروگرام کے مطابق ہوئے مگر اس میں بھی کلام نہیں کہ وہ عام انتخابات کے اس معیار پر مکمل طور پر پورے نہیں اترے جو ایک مستحکم اور مربوط جمہوری عمل کا مظہر ہوتے ہیں۔ جن حالات میں اور جن پابندیوں کے ہوتے ہوئے ایران میں عام انتخاب ہوئے انہیں اگر الیکشن سے زیادہ سلیکشن کہا جائے تو ہرگز بے جا نہ ہوگا۔ ایران کے بزرگ اور محترم حزب اختلاف کے لیڈر اور نہضتِ آزادی ایران کے سربراہ آقائے مہدی بازرگان کو گذشتہ سال کے صدارتی انتخابات میں حصہ لینے سے روک دیا گیا تھا اور صدر خامنہ ای کا انتخاب عملاً ایک واحد امیدوار کی حیثیت سے ہوا۔ اتنا ضرور ہے کہ بازرگان کی پارٹی پر قانونی طور پر کوئی پابندی نہیں۔ شہر کی بارونق شاہراہ پر اس کا دفتر ہے مگر بظاہر اسے جلسے جلوس کی وہ آزادی نہیں جو ایک جمہوری نظام کی جان ہوتی ہے۔ قیام ایران اور اکثر ایرانی دوستوں سے گفتگو کے دوران جو سب سے زیادہ تکلیف ایک پاکستانی کو ہوتی ہے وہ بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ اور پاکستان کے حال اور مستقبل کے بارے میں ان کی منفی اور مایوس کن آراء ہیں ہر چند کہ قائد مرحوم و مغفور کا تعلق خود اثنا عشری فرقے سے تھا تاہم اہل ایران (میری مراد صرف ان گنے چنے افراد سے ہے جن سے مجھے شرفِ ملاقات ہوا) ان کے مذہبی عقائد اور شعائر کے متعلق کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے۔ وہ ان کی فراست اور قیادت کے قائل ہیں مگر ان کی ذات سے نہ صرف متاثر نہیں بلکہ ان کی محبوب اشیائے خورد و نوش کے حوالے سے اسلام سے ان کی عدم وابستگی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جسے کسی طرح بھی مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پاکستان کے بارے میں بھی ان کے عجیب عجیب نظریات ہیں۔ اس ضمن میں یہاں ایک انتہائی تکلیف دہ تجربہ تو یہ رہا کہ ٹوپی بغیر وہ ہمیں ہندی ہی کہتے ہیں۔ مانا کہ متعدد بھارتیوں اور پاکستانیوں کی

شکلیں، لباس اور زبان بڑی حد تک ایک سے ہیں اور اکثر ان میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ صرف پاکستانی ہی کو ہندی کیوں سمجھا جاتا ہے ہندو یا ہندوستانی کو پاکستانی کیوں نہیں۔

رہا پاکستان کے مستقبل کا تو اسکے بارے میں ان کی بہت خوش آئند رائے نہیں۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد ملک جن نامساعد حالات سے دوچار چلا آرہا ہے ان کے حوالے سے اہل ایران اکثر اس کے مستقبل کے بارے میں مایوسی کا اظہار کرتے ہیں۔ سندھ کے حالات کے متعلق بھی ان کی رائے ایک خاص قسم کی نوعیت کی حامل ہے وہ یہی سمجھتے ہیں کہ اگر وہاں کے حالات جلد نہ سنبھلے تو بگڑتے ہی چلے جائیں گے۔ جس طرح احوال وطن مجھے ایران سے نظر آئے انہیں کسی طرح بھی اطمینان بخش قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پاکستان سے متعلق جو بھی خبریں تہران کے انگریزی روزناموں میں چھپیں ان کا تعلق صرف فرقہ وارانہ تصادم، ملک میں عام بے چینی اور افراتفری سے تھا۔ (بشکریہ: روزنامہ جنگ لاہور)

بقیہ: رفتارِ کار

ہمارے رفقاء نے اسلام کے انقلابی منشور اور تنظیم اسلامی کے تعارف پر مشتمل تعارفی کتابچہ کی پچیس ہزار اور "قرآن کیا چاہتا ہے" کی دو ہزار کاپیاں تقسیم کیں اور اس اجتماع کے دوران علماء سے ایمان و یقین کی باتیں سن کر اپنے قلوب و اذہان کو منور کیا۔ امیر تنظیم کے فیصلے کے مطابق مختلف مکاتب فکر کی متحدہ شریعت محاذ میں تنظیم اسلامی بھی شامل ہے۔ ۸ نومبر کو جامعہ نعیمیہ گڑھی شاہو لاہور میں متحدہ شریعت محاذ کنونشن میں امیر تنظیم اسلامی نے مختصر خطاب فرمایا اور رفقائے تنظیم اسلامی نے بھی نمایاں انداز میں بھرپور شرکت کی۔ اس مقصد کے لئے مختلف اور موزوں الفاظ میں کتبے تیار کروائے گئے تھے۔ کافی رفقاء ان کتبوں کو اٹھا کر تقریباً ۴ گھنٹے تک کنونشن کے باہر کھڑے رہے اور علماء اور کنونشن میں آنے والوں کو خوش آمدید کہتے رہے۔ ۱۸ نومبر کو اسلام آباد میں پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے متحدہ شریعت محاذ کے زیر اہتمام مظاہرہ میں بھی تنظیم اسلامی کے رفقاء نے بھرپور شرکت کی۔ جناب امیر تنظیم اسلامی کی غیر موجودگی کی بنا پر جناب میاں محمد نعیم صاحب قیم تنظیم اسلامی پاکستان نے جو کہ متحدہ شریعت محاذ شہر لاہور کے نائب صدر بھی ہیں تنظیم اسلامی کے نمائندہ کی حیثیت سے اس اجتماع سے مختصر خطاب کیا۔ تنظیم اسلامی لاہور کے قریباً ڈیڑھ سو رفقاء نے اس مظاہرہ میں شرکت کی۔ علاوہ ازیں پشاور۔ گجرات۔ وزیر آباد۔ راولپنڈی اور اسلام آباد کے اکثر رفقاء نے بھی اس میں حصہ لیا۔ اسلام آباد اور راولپنڈی کے رفقاء نے پلے کارڈز اور بینرز کے ذریعہ اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ تنظیم اسلامی لاہور کے رفقاء کو گذشتہ ہفتہ ایک پندرہ روزہ تربیتی پروگرام دیا گیا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ انشاء اللہ العزیز اس سے بہت مفید نتائج برآمد ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنا پسندیدہ بندہ بنالے اور اقامت دین کی جدوجہد میں اپنے جسم و جان کی صلاحیتیں اور اپنے مال و منال کو صرف کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

پاکستان کا
نمبر
1
بائیسکل
SOHRAB
سہراب

Regd. L. No 7350

MONTHLY "MEESAQ" LAHORE

Vol. 35 | DECEMBER 1986 | No. 12

ان شاء اللہ العزیز

تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام

سات روزہ کل پاکستان تربیتی اجتماع

جمعرات ۲۵ دسمبر ۸۶ء (بعد نماز ظہر) تا جمعرات یکم جنوری ۸۷ء (قبل نماز ظہر)

بمقام: میدان متصل جامع مسجد فاروق اعظم، نارتھ ناظم آباد، کراچی

ڈاکٹر اسرار احمد امیر تنظیم اسلامی

روزانہ بعد نماز عشاء درس قرآن دیں گے

- روزانہ فجر تا ظہر : تنظیمی و تربیتی پروگرام
- " عصر تا عشاء : دعوتی پروگرام

امراء اور نقیب حضرات سے زیادہ سے زیادہ رفقاء اور احباب کی شرکت کو ممکن بنانے کے لیے ترجیحی بنیادوں پر پروگرام بنائیں۔

رابطہ: دفتر تنظیم اسلامی کراچی، برنس روڈ کراچی فون ۲۱۶۵۸۶

ناظم رابطہ عبدالواحد عاصم شائننگ ٹریڈرز آرام باغ کراچی فون ۲۱۹۵۷۱-۲۱۴۷۰۹

المعلن: چودھری غلام محمد معتمد عمومی تنظیم اسلامی

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی (پاکستان) ۶۷ اے علامہ اقبال روڈ لاہور فون: ۳۰۵۱۱۰